بیادگار: محبوب العلماء والصلحاء

حضرت اقدس مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی قدس سرہ

قرآن وسنّت اور روایاتِ اسلافِ اُمّت کے آئینہ میں
راہِ تصوّف وسلوک کا قلمی ترجمان!

ماہنامہ

فَیضانِ نقشبندؒ

جلد (۱) شمارہ (۴) بابت ماہِ جولائی ۲۰۲۶ء

مُدیر

مفتی سیّد احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی

خانقاہ نقشبندیہ مجدّدیہ اورنگ آباد

www.ilmozikr.com

فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہیں

محبوب العلماء والصلحاء
حضرت اقدس مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہ

مؤمن کی زندگی کا ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ وہ اللہ رب العزت کو فاعلِ حقیقی سمجھتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے، لہٰذا ہر معاملے میں اس کی توجہ اللہ رب العزت کی ذات کی طرف رہتی ہے۔ مؤمن کو اللہ کے وعدوں پہ بھروسہ ہوتا ہے، یقین ہوتا ہے، اعتماد ہوتا ہے، اس کے دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ اگر میں اللہ رب العزت کے حکم کے مطابق زندگی گزاروں گا تو اللہ میری مدد فرمائیں گے اور وہ مجھے کامیاب زندگی عطا کریں گے۔

چناں چہ اللہ رب العزت نے قرآنِ مجید میں فرمایا: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً (سورۃ النحل: ۹۷)

ترجمہ: ''جس نے بھی نیک اعمال کیے اور وہ ایمان والا ہوا تو ہم ضرور بالضرور اس کو نیک، پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے۔''

(خطباتِ فقیر، ج: ۴، ص: ۲۴۵)

قرآن وسنّت اور روایاتِ اسلافِ اُمّت کے آئینہ میں
راہِ تصوّف وسلوک کا قلمی ترجمان!

ماہنامہ

فیضانِ نقشبند

جلد(۱) شمارہ(۴) بابت ماہِ جولائی ۲۰۲۶ء

Volume No.: 1 Issue No.: 4 July 2026

مُدیر

مفتی سیّد احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی

مجلس ادارت

مفتی سیف اللہ قاسمی رائے چوٹی
مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی
مولانا محمد عمر قاسمی کاماریڈی

خانقاہ نقشبندیہ مجدّدیہ اورنگ آباد

www.ilmozikr.com

اہم وضاحت

''ماہنامہ فیضان نقشبند کے تمام مضامین دراصل حضرت مدیر محترم مدظلہ کے مختلف بیانات اور دروس کی تحریری ترتیب ہے۔'' (ادارہ)

فہرستِ مضامین

قندیلِ ربانی (درسِ قرآن عظیم الشان)	پیارے اللہ! مجھے ایسا بنا دیجئے کہ میں آپ کو پسند آجاؤں!	ضبط وترتیب: مولانا محمد عمر قاسمی کامارپڈی	۳
نورِ نبوت (درسِ حدیث شریف)	شوقِ لقائے محبوب۔۔۔!	ضبط وترتیب: مفتی سید عبدالرافع قاسمی	۱۰
سخن اوّلیں	تاثرات ومشاہداتِ حرم	مدیرِ محترم	۱۳
درسِ عقائد	اللہ پاک ہر چیز پر قادر ہیں	ضبط وترتیب: مفتی سیف اللہ قاسمی صاحب	۱۹
اکابر شناسی	نسبتِ دارالعلوم اور نسبتِ قاسمیت میں فرق	ابوسیّد محمد اللہ غوری نقشبندی مجددی	۲۳
خطوط ہائے راہِ معرفت	درسِ قصدُ السبیل	مفتی احمد اللہ غوری نقشبندی مجددی	۲۶
سلوک کی ڈاک	ہدایۃ السالکین	ضبط وترتیب: مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی	۴۶
اصلاحی وتربیتی منظوم کلام	چھوڑ دے چون وچرا تجویز سے کیا کام ہے	عارف باللہ حضرت مولانا شاہ احمد صاحب پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ علیہ	۴۹

قندیلِ ربّانی

(درسِ قرآنِ عظیم الشان)

پیارے اللہ! مجھے ایسا بنا دیجئے کہ میں آپ کو پسند آجاؤں!

ضبط وترتیب: مولانا محمد عمر قاسمی کامار یڈی

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا ، وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ، یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا (سورۂ مریم، آیت: ۴، ۵، ۶)

ترجمہ: حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں (بوجۂ پیری کے) کمزور ہوگئیں اور سر میں بالوں کی سفیدی پھیل گئی اور (اس کے قبل کبھی میں) آپ سے مانگنے میں اے میرے رب! ناکام نہیں رہا ہوں اور میں اپنے بعد (اپنے) رشتہ داروں کی طرف سے اندیشہ رکھتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، سو (اس صورت میں) آپ مجھ کو اپنے پاس سے ایک ایسا وارث (یعنی بیٹا) دے دیجیے کہ وہ (میرے علومِ خاصہ میں) میرا وارث بنے، یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا وارث بنے اور اس کو اے میرے رب! اپنا پسندیدہ بنائیے۔

تشریح: قرآنِ عظیم الشان کتابِ تلاوت بھی ہے اور کتابِ ہدایت بھی۔ اس میں ساری انسانیت کے لیے رشد و ہدایت کے اسرار و رموز اور فہمائش و رہنمائی کے بہت ہی پیارے اور نرالے طور طریق پنہاں ہیں؛ چناں چہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے قصص و واقعات اور بندگانِ خدا کے احوال و حکایات میں (بطورِ خاص) تثبیتِ قلبی اور تذکیرِ انسانی کا راز مضمر ہے؛ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (سورۂ یوسف، آیت: ۱۱۱)

استاذ ابو ہریرہ اکیڈمی، اورنگ آباد (آن لائن)

ترجمہ: ”یقیناً ان کے واقعات میں عقل وہوش رکھنے والوں کے لیے بڑا عبرت کا سامان ہے۔“

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ اپنی اولاد کے تئیں دینی وایمانی ترقی اور روحانی واخلاقی تربیت کے تعلق سے انتہائی فکرمند اور نہایت حساس رہتے تھے۔ مذکورہ بالا آیت میں بھی سیدنا حضرت زکریا علیہ السلام اپنی پیرانہ سالی میں طلبِ اولاد کی دعا کے ساتھ ساتھ اولاد کی صالحیت اور مقبولیت کی بھی التجا کر رہے ہیں۔ حضرت امام رازیؒ فرماتے ہیں: قَدَّمَ زَكَرِيَّا عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَى طَلَبِ الْوَلَدِ أُمُورًا ثَلَاثَةً أَحَدُهَا: كَوْنُهُ ضَعِيفًا، وَالثَّانِي: أَنَّ اللهَ مَا رَدَّ دُعَاءَهُ أَلْبَتَّةَ، وَالثَّالِثُ: كَوْنُ الْمَطْلُوبِ بِالدُّعَاءِ سَبَبًا لِلْمَنْفَعَةِ فِي الدِّينِ (تفسیر کبیر: ۲۱/ ۵۸)

(حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا سے پہلے تین باتیں عرض کیں: (۱) اپنی کمزوری کا اظہار (۲) اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کا اعتراف کہ پیارے اللہ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کو کبھی بھی رد نہیں فرمایا ہے، (۳) دعا کا مقصود منفعتِ دینی کا حصول ہے۔)

پھر آگے دعا میں ایسا بیٹا مانگا جس میں خصوصاً تین صفات ہوں: (۱) فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا (ایسا بیٹا عطا فرمائیے جو دینی امور میں مددگار ہو)، (۲) يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ (علومِ الٰہیہ، احکامِ شرعیہ اور نبوت ورسالت میں میرا اور آلِ یعقوب کا وارث ہو) (۳) وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا (اے میرے رب! اسے رضی بنا دیجیے یعنی ایسا بنائیے کہ وہ آپ کے نزدیک پسندیدہ ہو)۔

اس دعا سے حاصل ہونے والے اہم اسباق میں سے ایک یہ ہے کہ ہم اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے ”اللہ کے پسندیدہ“ بندے بننے کی فکر کریں؛ چناں چہ ہر بندۂ مؤمن کو یہی فکر دامن گیر رہنی چاہیے کہ اے اللہ! مجھے ایسا بنا دیجیے کہ میں آپ کو پسند آجاؤں۔

خود پسندی کے بجائے خدا کی پسند بننے کی فکر ہو

ایک عاشقِ صادق کی فکر یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح محبوب کو پسند آجائے، اوروں سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ پس دنیا والوں کی نظر میں پسندیدہ بننے کے بجائے، اسی طرح خود اپنی نظر میں پسندیدہ بننے کے بجائے اللہ پاک کی نظر میں پسندیدہ بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہمارے حضرت جی (محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی) قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ”جس شخص کی اپنے آپ پر پسندیدگی کی نظر پڑنے لگے اسی وقت اللہ پاک کی ناپسندیدگی کی نظر اس پر پڑنی شروع ہوجائے گی کہ اب یہ میرا ناپسندیدہ ہے، اور جس لمحے کسی کی اپنے آپ پر ناپسندیدگی کی

نظر پڑے گی اسی لمحے اللہ پاک کی پسندیدگی کی نظر اس پر پڑنی شروع ہوجائے گی کہ یہ میرا ہے۔"

اسی ضمن میں ہمیں ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اپنے آپ کو پسند کرنا اور تعریف کا خواہاں ہونا عجب اور خود پسندی کی علامت ہے، تصوف وسلوک کی دنیا میں خود پسندی ایک بہت بڑا مرض ہے، جب تک یہ مرض ختم نہ ہو تب تک سلوک کا ایک قدم بھی طے نہیں ہوتا۔ صرف یہی نہیں؛ بلکہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں کہ: "سالک اس وقت تک واصل نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے آپ کو خسیس کتّے سے بھی بدتر نہ سمجھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کتا اپنے مالک کا زیادہ وفادار ہوتا ہے؛ جب کہ ہم اتنے وفادار نہیں ہیں، کتا تو روکھی سوکھی کھاتا ہے اور پھر رات کو جاگ کر پہرا دیتا ہے، جب کہ ہم مالک کی ہزار نعمتیں کھاتے ہیں، ساری رات بستر پر سوتے ہیں اور پھر بھی شکر نہیں کرتے۔ (حضرت جی دامت برکاتہم کا اندازِ تربیت: ج:۲،ص:۶۲)

امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ملفوظ شریف کی روشنی میں اگر معاشرہ کا جائزہ لیا جائے تو سو میں دو افراد بھی ایسے نظر نہیں آئیں گے جو اپنے آپ کو برا سمجھتے ہوں، دوسروں کو غلط سمجھنے والے تو بہت مل جائیں گے؛ لیکن اصل مطلوب یہ ہے کہ اپنے آپ کو برا سمجھا جائے۔

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ (ان لوگوں کے حوالے سے جو فکرِ آخرت سے غافل اور اللہ کے پسندیدہ بننے سے بے فکر رہتے ہیں) فرماتے ہیں ؎

یہی تجھ کو دُھن ہے رہوں سب سے بالا
ہو زینت نرالی ہو فیشن نرالا
تجھے حسنِ ظاہر نے دھوکے میں ڈالا
جِیا کرتا ہے کیا یونہی مرنے والا؟

ہمارے حضرت جی قدس سرہ فرماتے تھے کہ "دنیا پرستوں کا جملہ یہ ہوتا ہے کہ اچھا جیؤ اور اچھا جینے دو! اور آخرت کے چاہنے والوں کا جملہ یہ ہوتا ہے کہ اچھا مرو اور اچھا مرنے دو!" دنیا میں ہم اچھا جینے کے لیے نہیں؛ اچھا مرنے کے لیے آئے ہیں۔ جب یہ حقیقت ہمارے ذہن ودماغ میں نقش ہوجائے تو پھر دنیا کی ساری فکریں ختم ہوجائیں گی۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کی کتنی فکر رہتی تھی کہ اللہ پاک راضی ہیں کہ نہیں؟ چناں چہ اس کو سمجھنے کے لیے سفرِ طائف کا دلخراش واقعہ ذرا یاد کیجیے کہ جب دن بدن مکہ والوں کی تکلیفیں بڑھتی چلی گئیں تو محبوب علیہ السلام نے یہ سوچا کہ اہلِ طائف کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک طرح کی رشتہ داری ہے۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ آپ کی

رضاعی ماں ہیں۔اس رشتہ کی وجہ سے یہ اُمید ہوئی کہ شاید طائف والے رشتۂ رضاعت کی وجہ سے اللہ کے پیغمبر کو کچھ قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ چناں چہ حضرت ام المؤمنین خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات کے تین ماہ کے بعد سن ۱۰ نبوت میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر نبی علیہ السلام طائف تشریف لے گئے۔اور طائف والوں کے سامنے ایمان کی دعوت پیش فرمائی؛لیکن طائف والوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جس قدر بدتمیزی اور ظلم وستم کا معاملہ کیا، اسلامی تاریخ اس کو فراموش نہیں کرسکتی۔ ان بدبختوں نے آپ کے پیچھے غنڈوں اور اوباشوں کو لگادیا جنھوں نے آپ پر پتھر پھینکے اور جسمِ اطہر کو لہولہان کردیا۔

آخر کار آپ کو طائف سے نہایت شکستہ دل واپس لوٹنا پڑا؛لیکن پھر بھی زبانِ نبوت پر حرفِ شکایت نہیں؛ بلکہ یہ دعائیہ الفاظ آئے کہ "بارالہا! میں آپ ہی سے اپنی کمزوری و بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ یاارحم الراحمین! آپ کمزوروں کے رب ہیں اور آپ ہی میرے بھی رب ہیں۔آپ مجھے کس کے حوالے کررہے ہیں؟ کیا کسی بیگانے کے جو میرے ساتھ تندی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے جس کو آپ نے میرے معاملے کا مالک بنادیا ہے؟ اگر آپ مجھ پر غصہ نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں؛لیکن آپ کی عافیت میرے لیے زیادہ کشادہ ہے۔ میں آپ کے چہرے کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہوگئیں اور جس پر دنیا وآخرت کے معاملات درست ہوئے کہ آپ مجھ پر اپنا غضب نازل کریں یا آپ کا عتاب مجھ پر وارد ہو۔آپ کی ہی رضا مطلوب ہے؛ یہاں تک کہ آپ خوش ہوجائیں اور آپ کے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔"

اللَّهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُوْ ضَعْفَ قُوَّتِيْ، وَقِلَّةَ حِيلَتِي، وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ، أَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَأَنْتَ رَبِّيْ، إِلَى مَنْ تَكِلُنِيْ إِلَى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ، أَمْ إِلَى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهُ أَمْرِيْ إِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلَا أُبَالِيْ، وَلَكِنَّ عَافِيَتَكَ هِيَ أَوْسَعُ لِيْ، أَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، مِنْ أَنْ تُنْزِلَ بِيْ غَضَبَكَ، أَوْ يَحِلَّ عَلَيَّ سَخَطُكَ، لَكَ الْعُتْبَى حَتَّى تَرْضَى، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ

(السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: ج:۲،ص:۶۰، سعی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم إلی الطائف)

مذکورہ دعا دراصل نبی علیہ السلام کی طرف سے عجز و نیاز کا اظہار اور اپنی بے بسی کا اعتراف ہے؛لیکن اس میں سب سے طاقتور اور مرکزی جملہ ہے "إِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلَا أُبَالِيْ" (اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو مجھے (دنیا کی) کوئی پروا نہیں ہے)

امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسی حالت میں (جب کہ جسم اطہر لہولہان ہے) رضائے الٰہی کی فکر ہے اور ہمیں ساری نعمتیں میسر آنے کے بعد بھی رضائے الٰہی کی فکر نہیں ہوتی؛ جب کہ ہمارے مشائخ کا معاملہ یہ تھا کہ نعمتیں زیادہ نصیب ہوتیں تو اللہ کے سامنے رونے لگ جاتے کہ اے اللہ! کہیں آپ ہم سے ناراض تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا ہی میں ہمیں اچھی اچھی نعمتیں دے کر آخرت میں ہم تہی دست ومحروم کر دیے جائیں۔ کیوں کہ آپ دشمنوں کو دنیا ہی میں بدلہ عطا فرما دیتے ہیں؛ چناں چہ کسی نے کہا ؎

دشمنوں کو عیشِ آب و گِل دیا
دوستوں کو اپنا دردِ دل دیا

اللہ کا پسندیدہ ہونے کی علامت

بندہ کو چاہیے کہ ہر حال میں اللہ پاک کو راضی اور خوش کرنے کی مسلسل فکر اور بھرپور کوشش کرے؛ البتہ سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ اللہ پاک ہم سے راضی ہیں کہ نہیں؟ چناں چہ ایک بزرگ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ حضرت! آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ اللہ کو راضی کرنا چاہیے؛ لیکن مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ اللہ پاک مجھ سے راضی ہیں؟ فرمایا: "بہت آسان ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ذرا تنہائی میں گردن جھکا کر بیٹھ جاؤ اور اپنے دل سے پوچھو کہ اے دل! جس حال میں اللہ نے تجھے رکھا ہوا ہے تو اپنے اللہ سے راضی ہے یا نہیں؟ بیمار ہے تو بیماری کی حالت میں اللہ سے راضی ہے؟ فاقے گزر رہے ہیں تو کیا اللہ سے راضی ہے؟ تجھے جس چیز کی خواہش ہے اور وہ نہیں مل رہی ہے تو کیا تو اس حالت میں اللہ سے راضی ہے؟ اگر جواب یہ آئے کہ ہاں! اپنے اللہ سے سو فیصد راضی ہوں تو یہ فیصلہ کر کے اٹھ جا کہ تیرا اللہ تجھ سے راضی ہے اور اگر عدمِ اطمینان اور شکایت والا جواب آئے تو سمجھ لے کہ اللہ تجھ سے ناراض ہے۔"

اسی لیے ہم نے اپنے حضرت جی قدس سرہ کو دیکھا کہ جب لوگ حضرت سے آپ کا مزاج دریافت کرتے تو اکثر یہ جواب دیتے: "جی الحمدللہ! میں اپنے اللہ سے بہت راضی ہوں" یہ جواب اسی وقت ممکن ہے جب اللہ راضی رہنے کی توفیق عنایت فرمائے؛ ورنہ عام طور پر لوگوں کے جواب کا انداز یہ ہوتا ہے کہ جی! چل رہی ہے بس زندگی، دعا کیجیے؛ گویا اللہ سے شکایت ہے۔

چناں چہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "اللہ نے تجھے جو کچھ (تھوڑا بہت) دیا ہے تو اس پر راضی ہو جا، اللہ پاک کل قیامت کے دن تیرے تھوڑے عمل پر راضی ہو جائیں گے"

پیا جسے چاہے وہی سہاگن

ہمارے اکابر مشائخ میں ایک بزرگ گزرے ہیں، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ (حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے اجل خلیفہ) ایک روز وہ اپنے مدرسے سے گھر کی جانب رواں دواں تھے کہ راستے میں ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ ماحول ناچ گانے اور لایعنی شور شرابے سے گونج رہا تھا، جہاں ایک فاحشہ عورت رقص کرتے ہوئے مسلسل ایک ہی مصرعہ دہرا رہی تھی:

پیا جسے چاہے وہی سہاگن

(وہ عورت تو اسے مجاز کے رنگ میں گا رہی تھی، مگر یہ الفاظ جب ایک صاحبِ دل) حضرت پھولپوریؒ کے کانوں سے ٹکرائے تو یک بہ یک حالت متغیر ہوگئی۔ حضرت پر ایسی لرزہ خیز کیفیت طاری ہوئی کہ آپ بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو عقیدت مندوں نے حیرت سے دریافت کیا: ''حضرت! ایک گناہ گار فاحشہ عورت کے بول پر ایسی جاں گداز کیفیت؟''

حضرت نے فرمایا: ''کہ مجھے نہیں پتہ کہ یہ کس کی زبان سے نکلا، میرے کانوں میں تو یہ جملہ پڑتے ہی قیامت کا نقشہ کھنچ گیا۔ ''وہ دن جب ہر نفس پکار رہا ہوگا: ''نفسی نفسی!'' جب ربِ ذوالجلال کی عدالتِ عظمیٰ لگی ہوگی، مجرم زنجیروں میں جکڑے لائے جارہے ہوں گے اور کسی کو نجات کا مژدہ تو کسی کو جہنم کا راستہ دکھایا جارہا ہوگا۔'' تو اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کل روزِ محشر اللہ پاک مجھے پسند کریں گے کہ نہیں کریں گے؟ اگر میرے مالک نے مجھے اپنی پسندیدگی کی نظر سے نواز دیا تو میرا بیڑا پار ہے؛ لیکن اگر اس نے رد کردیا، تو پھر کائنات میں میرا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔

اللہ اللہ! کیسا استحضار! کیسی فکرِ آخرت! چناں چہ خاصانِ خدا کی ایک نمایاں خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ کو آخرت سے جوڑ دیتے ہیں۔ پس ہر وقت بندہ کو اپنے مالکِ حقیقی کی رضا کا طلب گار رہنا چاہیے۔

اللہ کے مخلص بندوں کو دنیا کی تعریف، نام ونمود اور شہرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انہیں تو اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے اعمال کا کیا وزن ہوگا اور کیا قدر و قیمت ہوگی؟

چناں چہ مذکورہ بالا مصرعہ پر ہمارے حضرت جی قدس سرہ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک لڑکی کی شادی ہورہی تھی اور اس کی سہیلیاں اس کو دلہن بنا رہی تھیں۔ سب اس کی تعریفیں کررہی تھیں، وہ بیچاری دلہن سب کی تعریفیں سنتی اور خاموش رہ جاتی۔ کسی سہیلی نے کہا: اے اللہ کی بندی! سب لوگ تیری خوبصورتی اور سنگھار کی تعریف کررہے ہیں اور تو کسی کا شکریہ ادا نہیں کرتی۔ اس نے کہا کہ میں شکریہ تو ادا کرتی ہوں؛ لیکن میں سوچ رہی

ہوں کہ اگر میری سہیلیاں میری تعریف کرتی ہیں تو ان کی تعریف سے مجھے کیا ملے گا۔ اصل بات تو بس یہ ہے کہ میں جہاں جارہی ہوں، جس کے لیے تیار ہورہی ہوں وہاں میری تعریف ہو اور وہاں میں پسند آجاؤں۔ پیا جسے چاہے وہی سہاگن کا یہی مطلب ہے کہ خاوند جسے پسند کرے وہی دلہن۔

قصہ مختصر یہ کہ جس طرح دلہن کے دل میں دلہے کی پسندیدگی کی جتنی فکر ہوتی ہے اگر آج اتنی بھی فکر ہر مؤمن کے دل میں پیدا ہوجائے تو پھر وہ کبھی گناہ کا ارادہ بھی نہیں کرے گا۔

آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں ساری دنیا کو راضی کرنے کی فکر ہوتی ہے، لیکن اللہ کو راضی کرنے کی فکر نہیں ہوتی! ہمارے حضرت جی قدس سرہ فرماتے تھے کہ "شادی بیاہ کے موقع پر تو گھر کے نوکر اور ڈرائیور تک کو راضی کیا جاتا ہے؛ لیکن واقعۃً جس کو راضی کرنا ہے لوگ اس (اللہ) کو بھول جاتے ہیں۔"

یاد رکھیں کہ جس دن سے ہم اللہ کو راضی کرنے کی فکر میں لگ جائیں گے اللہ پاک ناراض دنیا کو ہم سے راضی کردیں گے۔

حدیث مبارکہ میں ارشادِ نبوی ہے: "مَنِ الْتَمَسَ رِضَاءَ اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللّٰهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ، وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَاءَ النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ وَكَلَهُ اللّٰهُ إِلَى النَّاسِ"

(کتاب الزہد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم/ حدیث: ۲۴۱۴)

ترجمہ: "جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتا ہے، چاہیں لوگ ناراض ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے لوگوں کی پریشانیوں سے کافی ہوجاتے ہیں اور جو اللہ کو ناراض کرکے لوگوں کی خوشنودی چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے حوالہ کردیتے ہیں۔"

اسی لیے سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی مناجات میں ایک مشہور دعائیہ شعر ملتا ہے جو ہم سب کے لیے سبق آموز ہے، فرماتے ہیں ؎

کوئی تجھ سے کچھ، کوئی کچھ مانگتا ہے
الٰہی میں تجھ سے طلب گار تیرا
تو کر بے خبر ساری خبروں سے مجھ کو
بس اک خبر دار رہوں تیرا

نُورِ نبوّت

(درسِ حدیث شریف)

شوقِ لقائے محبوب۔۔۔!

ضبط وترتیب: مفتی سید عبدالرافع قاسمی

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ أَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهُ (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، حدیث: ۶۵۰۷)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت ؓ سے مروی ہے کہ محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "جو شخص اللہ پاک سے ملنا پسند کرتا ہے اللہ پاک بھی اس سے ملنا پسند کرتے ہیں۔"

تشریح: محبت کا ایک لازمہ یہ بھی ہے کہ محبت کرنے والا اپنے محبوب سے ملاقات کے لیے بے چین رہتا ہے۔ دنیا کی عارضی اور فانی محبتوں میں بھی یہ بات دیکھی جاسکتی ہے اور ان سب سے بڑھ کر حضرات صحابہ کرام ؓ کی پاکیزہ زندگیوں کے مطالعے سے اس کا خوب خوب اندازہ ہوتا ہے۔ محبوب علیہ السلام کے چہرۂ انور کی زیارت ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی، آپ علیہ السلام کی خدمت میں حاضری، ان کے بے چین دلوں کا قرار اور ان کی تڑپتی روحوں کی راحت تھی۔ چناں چہ نمازوں کے موقعے پر انتظار کے لمبے لمبے وقفے ہوں کہ دشمنان اسلام کے روبرو ان کا جاں نثارانہ وسرفروشانہ کردار؛ پس منظر میں ان کی آتشِ عشق کی حرارت اور بے پناہ محبت کی کرشمہ سازیاں ہی نظر آئیں گی۔

مذکورہ بالا حدیث میں بھی محبت کے اسی بے تاب جذبے اور بے مثال تاثیرِ کشش کا بیان ہے۔ چناں چہ جب بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو اللہ پاک بھی اس سے محبت فرماتے ہیں۔ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا

استاذ ابوہریرہ اکیڈمی اورنگ آباد (آن لائن)

ہے کہ اللہ پاک کی طرف سے اپنے بندوں سے محبت کا اظہار پہلے ہوا ہے۔ قرآن عظیم الشان میں دیکھیں کہ کیسے مختلف انداز سے جگہ جگہ بندوں سے محبت وشفقت اور عفو وکرم کا اظہار فرمایا ہے؛ چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (سورۃ الزمر، آیت: ۵۳)

ترجمہ: "(اے محبوب علیہ السلام!) آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے (کفر وشرک کرکے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو، بالیقین خدا تعالیٰ تمام (گزشتہ) گناہوں کو معاف فرماوے گا، واقعی وہ بڑا بخشنے والا، بڑی رحمت والا ہے۔"

ہمارے حضرت جی قُدِّس سرُّہٗ اس آیت کے ضمن میں ارشاد فرماتے تھے کہ "سبحان اللہ! ذرا اندازِ بیان تو دیکھیے، جیسے ایک سخی اپنا مال خرچ کرنے کا ارادہ کرے اور اپنے کسی غلام یا نمائندے سے کہے کہ لوگوں کو بلاؤ۔۔۔ تو اس وقت لوگوں کو اطلاع دینے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ میں اپنے مال کو لٹانا چاہتا ہوں، اس لیے لوگوں کو بتادو، بالکل وہی انداز یہاں اپنایا اور یہ نہیں فرمایا کہ لوگوں کو بتادو یا انسانوں کو بتادو یا بندوں کو بتادو بلکہ فرمایا: "یٰعِبَادِیَ" "میرے بندے، جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، ان کو بتادو"۔ چناں چہ یہ لفظ "میرے" نے اس میں اور زیادہ حسن پیدا کردیا، سبحان اللہ!" اب بتائیے کہ جو آقا اتنا کریم ہو کہ اپنے بندوں کو اپنے نبیوں کی زبان سے اطلاعات بھجوا رہا ہو کہ میرے بندوں کو بتادو کہ میں مغفرت کرنے والا ہوں، میں رحمتیں برسانے والا ہوں؛ تاکہ وہ مغفرت اور رحمت سے حصہ پاسکیں، اس کی رحمت کتنی وسیع ہوگی"۔

اللہ تعالیٰ کا ہم پر ایک حق

جب اللہ پاک اپنے بندوں سے اس قدر محبت کرتے ہیں تو ہم پر فرض ہے کہ ہم بھی سب سے زیادہ ان سے محبت کریں۔ چناں چہ ایمان والوں میں جو اللہ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں، ان کے بارے میں قرآن عظیم الشان میں ارشاد فرمایا گیا: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۂ بقرہ، آیت: ۱۶۵)

ترجمہ: اور ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ہمارے حضرت جی قدس سرہٗ فرماتے تھے: (گویا اللہ پاک یوں فرمارہے ہیں) "واقعی اگر تم میرے ہو، مجھ پر ایمان رکھتے ہو تو پھر تم مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں چاہو گے۔"

اس آیت کے ترجمہ میں ساری تعبیرات ایک طرف اور یہ ایک جملہ ایک طرف کہ "ایمان والے اپنے مولیٰ سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتے، چاہے مقابلے میں جو بھی آجائے"۔ بہرحال اللہ پاک اس آیت میں بہ ظاہر خبر دے

رہے ہیں کہ ایمان والے اللہ پاک سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں؛ مگر اس آیت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ پاک ہم سے تقاضہ اور مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر ایمان والے ہو تو پھر سب سے زیادہ مجھ ہی سے محبت ہونی چاہیے۔

محبت وصال کا تقاضہ کرتی ہے!

چناں چہ اللہ پاک کی محبت میں رات دن تڑپنے والے اہل ایمان کے دلوں میں کبھی بڑی شدت سے یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ انہیں اپنے محبوب سے ملاقات کی سعادت نصیب ہو جائے۔ چناں چہ اس بنا پر ان کی تڑپ مزید بڑھ جاتی ہے، ایسے میں ان کی بے قراری کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے۔

چناں چہ وہ روتے ہیں، سسکتے ہیں، بلکتے ہیں، آہیں بھرتے ہیں، رات بسترِ راحت پر کروٹیں بدلتے ہیں۔ گویا زبانِ حال سے کہتے ہیں ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

لیکن عُشّاقِ الٰہی کے لیے یہ بات قیامت سے کم نہیں کہ اس دنیا میں محبوب حقیقی کا وصال ناممکن ہے۔

ہائے رے دل! جس کے وصال کی خاطر سب کا ہجر قبول کر لیا، جس سے جڑنے کے لیے سب سے کٹ گیا، جس کو منانے کے لیے دنیا بھر کی ناراضی قبول کر لی، جس کو پانے کے لیے خود کو لاشئہ بے جاں کر دیا، اس سے اس دنیا میں وصال ممکن ہی نہیں، اس بات سے تو عاشقوں کا دل ہی پھٹ جائے۔

مگر محبوبِ حقیقی نے اپنے سچے مُحبّینِ کے دلوں کی تسلی کے لیے اس دنیا میں نماز کو واسطہ اور ذریعہ بنایا کہ یہ محبوب سے ملانے اور محبوب سے قریب کرنے والی چیز ہے، اسی لیے اہل محبت کو نماز کا اسی طرح انتظار رہتا ہے جیسے نوشہ ابتدا میں رات کے آنے کا انتظار کرتا ہے۔ یہی کیفیت ہمارے نبی علیہ السلام کی ہوا کرتی تھی۔ جب یادِ الٰہی میں استغراق کی وجہ سے آپ بے قرار و بیتاب ہو جاتے تو حضرت بلال ؓ سے فرماتے: قُمْ يَا بِلَالُ، فَأَرِحْنَا بِالصَّلَاةِ (سنن ابی داؤد) (بلال! اٹھو اور ہمیں نماز سے راحت پہونچاؤ)

ہمارے حضرت جی قدس سرہٗ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اکثر ارشاد فرماتے تھے کہ: "اگر دنیا میں نماز کا تحفہ بندۂ مؤمن کو اللہ پاک نہ دیتے تو عشاق (الٰہی) کے دل پھٹ جاتے"۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ پاک کو اپنے بندوں سے بے پناہ محبت ہے اور اللہ پاک بندوں سے بھی محبت کا تقاضہ کرتے ہیں؛ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنے دلوں کو صرف اور صرف اللہ کی محبت کے لیے خالص کر دیں کہ یہی لقائے الٰہی کا واحد ذریعہ ہے۔ اللہ پاک ہمیں اس کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

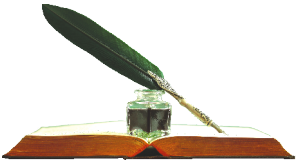

سُخنِ اوّلیں

تاثرات ومشاہداتِ حرم

از: مدیر

اللہ پاک کی توفیق سے اور محض اللہ ہی کی توفیق سے اس عاجز کو اس سال حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس نعمتِ عظمیٰ پر اور اللہ کے اس احسانِ عظیم پر جسم کے انگ انگ سے بارگاہِ الٰہی میں نذرانۂ تشکر پیش ہے۔

حرمین شریفین سے واپسی پر عموماً لوگ تاثراتِ سفر جاننا چاہتے ہیں اور سفر کے احوال دریافت کرتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ جس سرزمین سے ہم سب مسلمانوں کی قلبی وابستگی ہے اور جس خطۂ پاک سے ہم سب کا ایمانی وروحانی رشتہ ہے، وہاں سے باخبر ہونا، ہم سب کا ایمانی تقاضہ ہے۔

چناں چہ تاثرات کے ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ الحمدللہ حرمین شریفین کا یہ سفر ہر اعتبار سے عمدہ، بہتر اور خوب تر رہا۔ دنیا میں یہی تو ایک سفر ہے، جو سب سے افضل اور بہتر ہے، بلکہ صحیح معنوں میں یہی سفر ہے، جو وسیلۂ ظفر کہلائے جانے کے لائق ہے۔ ورنہ سفر کو لوگوں نے سقر سے بھی تعبیر کیا ہے۔

سفر میں عموماً تعب اور تھکن ہوتی ہے، دشواریاں اور تکلیفیں پہونچتی ہیں اور طرح طرح کی مشقتوں سے سابقہ پڑتا ہے؛ لیکن حرمین شریفین کا سفر، ایسا مبارک سفر ہے کہ اس میں تو تکلیف بھی عینِ راحت ہے، مشقت بھی ایک طرح کی سہولت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ کوئی عام سفر نہیں ہے، بل کہ یہ سفرِ محبت ہے۔ اور یہ سفر اس لیے کیا جاتا ہے کہ بارگاہِ محبوب میں نیازِ محبت پیش کی جائے، ان کے دربارِ عالی میں جابہ جا جبینِ نیاز خم کی جائے، اور ان کے کوچہ میں قدم بہ قدم جان ودل لٹائے جائیں۔ پھر محبت کی اس راہ میں کلفت ومشقت کی گنجائش کہاں؟ اس کا تو خیال بھی حرام ہے! ع

جائز نہیں اندیشۂ جاں عشق میں اے دل!
ہشیار! کہ یہ مسلک تسلیم و رضا ہے

ویسے بھی اب حرمین شریفین کا مبارک سفر پچھلے زمانوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو سراسر راحت ہی راحت ہے، پچھلے دور میں لوگ پانی کے جہازوں سے سفر کیا کرتے تھے، حرمین پہونچنے تک کبھی ہفتہ، کبھی دو ہفتے اور اگر سمندر میں طغیانی رہتی اور موسم ناموافق رہتا تو پھر کبھی کبھار مہینہ بھی لگ جاتا تھا، پھر سرزمین حجاز میں بھی آج کی سی سہولیات نہیں تھیں، سواریاں اونٹوں کی، راستے پُر پیچ، سورج سروں پر، گرمی کی وجہ سے پیاس کی شدت اور ریگستان میں پانی کی قلت؛ غرض بڑی دشواریوں اور مشقتوں سے حج کے سفر ہوا کرتے تھے؛ لیکن آج اللہ پاک نے ایسی سہولتیں اور نعمتیں عطا فرمائی ہیں کہ تکلیفوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ بل کہ بہت سے مقامات پر تو راحتیں ہی راحتیں نصیب ہوتی ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ یہ سفر، کس غرض سے ہو رہا ہے؟ مقصد سفر نہ تو تفریح ہے، نہ تجارت، اور نہ ہی کوئی دنیاوی حاجت وضرورت؛ بلکہ غرض ہے تو محض دیدار بیت اللہ کی اور تمنا ہے تو صرف نبی علیہ السلام کے قدموں میں حاضری کی۔ لہٰذا ایسے مبارک سفر کے لیے تو جان کا نذرانہ پیش کیا جائے، پھر بھی کم ہے۔

ہمارے بہت سے اکابر ایسے گذرے ہیں کہ جنہیں بارہا خواب میں نبی علیہ السلام کی زیارت کی نعمت نصیب ہوئی، لیکن اپنے اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے انہیں حرمین شریفین حاضر ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن یہ ان کی بزرگی اور ولایت کے منافی نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حرمین شریفین حاضر ہونے کی جب بھی بات ہوگی تو "حاضر ہونے" کی تعبیر ہی استعمال کی جائے گی۔ چاہے جتنی بڑی شخصیت ہو، ان کے لیے بھی یہی تعبیر استعمال کی جائے گی۔ کسی صاحب نے ہمارے حضرت جی قدس سرہ سے ایک دفعہ دریافت کیا تھا کہ حضرت! آپ حرمین کب تشریف لانے والے ہیں؟ حضرت جی قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ تشریف لانے کی نہیں بلکہ حاضر ہونے کی جگہ ہے۔"

چناں چہ یہ بات "کہ دربارِ الٰہی اور دربارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضری ہو رہی ہے" اگر ذہن میں رہے تو پھر حرمین شریفین کے آداب کی رعایت آسان ہو جائے گی ان شاء اللہ۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ دیدارِ بیت اللہ اور زیارتِ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ بڑی اور بہت بڑی نعمتیں ہیں؛ لیکن ایسی نہیں کہ اس پر ایمان موقوف ہو؛ بلکہ نفس ایمان تو کجا، کمالِ ایمان بھی اس پر موقوف نہیں ہے۔ بل کہ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ حرمین شریفین کی پاکیزہ سرزمین پر رہنے والا اور آگے بڑھ کر ہر دن آنکھوں سے بیت اللہ کا دیدار کرنے والا اور صبح وشام روضۂ اطہر کی زیارت کرنے والا شخص بھی بہت ممکن ہے کہ منافق ہو اور وہاں سے ہزاروں میل دور رہنے والا شخص مؤمن کامل ہو۔

چناں چہ جب کبھی اللہ پاک کی توفیق سے اس عاجز کو مدینہ پاک حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوتی ہے تو اکثر وہ بات بھی یاد آجاتی ہے، جو حدیث پاک میں مذکور ہے کہ قیامت سے پہلے دجال جب پوری دنیا کا چکر لگائے گا لیکن مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں حفاظتِ خداوندی کے تحت وہ داخل نہیں ہو سکے گا تو ایسے میں بہت سے لوگ جو کافر اور منافق ہوں گے، خود سرزمین مدینہ سے نکل نکل کر اس کے پاس پہونچیں گے۔

آج بھی کتنے ایسے لوگ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں نظر آجاتے ہیں، جن کے چہرے ڈاڑھی نہیں ہوتی، اور کتنے لوگ ہوتے ہیں جن کے ٹخنوں سے نیچے کپڑے لٹک رہے ہوتے ہیں، حالاں کہ وہ ظاہری اعتبار سے "بلد امین" اور "مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" میں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی سنتِ نبوی سے کوسوں دور ہے۔ اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ حرمین شریفین کی حاضری اپنی جگہ؛ لیکن اس پر ایمان کا کمال یا نقص موقوف نہیں۔ چناں چہ کوئی بندۂ خدا سرزمین حرمین سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی متبعِ سنت ہوسکتا ہے اور ایسے شخص کو اسی اعتبار سے قربِ خداوندی اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعمت میسر ہوتی ہے، جب کہ کچھ لوگ اس مقدس و بابرکت سرزمین پر دن و رات گذارنے کے باوجود ان نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔

☆☆☆

اب کی بار حرمین شریفین حاضری کے موقعے پر تصویر کشی اور ویڈیو گرافی کے بڑھتے ہوئے بے ادبی کے مناظر دیکھے تو دل پر غم کی ایک گہری کیفیت ہے۔ یہ بات دل میں آئی اور شدت سے آئی کہ اس منکر پر پہلے بھی نکیر کرتے تھے لیکن اب پہلے کی بہ نسبت بہت سختی سے نکیر کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک زمانہ تھا، اور ہم نے خود آنکھوں سے وہ دور دیکھا ہے، کہ حرمین میں اگر کسی کے ہاتھ میں کیمرے والا موبائل نظر آجاتا تو حفاظتی اہلکار (سیکورٹی کے افراد) اسے ضبط کر لیتے تھے بل کہ کبھی کبھار تو توڑ بھی دیتے تھے۔ لیکن آج خود وہی بڑی بے باکی سے تصویریں لے رہے ہیں، پھر دوسروں کو کیسے روکیں گے؟ بہت پہلے خود بعض ائمۂ حرمین کی زبانی بھی سنا تھا کہ تصویریں نہ لیں کہ یہ ناجائز ہے۔ لیکن آج صورت حال بالکل مختلف ہوگئی ہے۔

ہاں! اس دفعہ ایک اچھی بات یہ دیکھنے میں آئی کہ روضۂ اطہر کے پاس پہلے جو تصویر کشی اور ویڈیو گرافی کا طوفانِ بدتمیزی برپا ہوا کرتا تھا، اس میں کمی نظر آئی۔ اس دفعہ نگران منع کر رہے تھے اور یہ ایک اچھا تاثر رہا۔ ورنہ تو ایسی بے ادبیاں ہوتی تھیں کہ الامان والحفیظ! سابق میں ایسے مناظر بھی دیکھے گئے کہ روضۂ اطہر کی زیارت کے وقت باادب صلوۃ وسلام پیش کرنے کے بجائے جالی مبارک کی طرف پیٹھ کیے ہوئے ویڈیو بنانے میں مصروف ہیں۔ نعوذ باللہ!

مدینہ منورہ زَادَھَا اللّٰہُ شَرَفًا وَّعَظَمًا حاضری کے موقع پر عموماً وہ مکاشفہ بھی یاد آجاتا ہے، جو ایک بزرگ سے منقول ہے۔ ''مکاشفہ اگرچہ حجت اور دلیل شرعی نہیں ہے، تاہم دیگر دلائل اور مشاہدات سے اگر اس کی تائید حاصل ہوجائے تو اس کو بیان کرنے میں اور اس میں بتائی گئی باتوں پر عمل کرنے میں حرج نہیں'' وہ بزرگ مدینہ میں رہتے تھے اور انہیں کشف بھی بہت کثرت سے ہوا کرتا تھا۔ چناں چہ ایک معتبر عالم دین کا بیان ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے اپنا ایک مکاشفہ بیان کیا کہ نبی علیہ السلام روضۂ اقدس میں تخت پر سر جھکائے ہوئے تشریف فرما ہوتے ہیں اور لوگ آپ علیہ السلام کی خدمت میں سلام پیش کرتے ہیں۔ تو نبی علیہ السلام بہت سارے لوگوں کے سلام کا جواب بھی نہیں دیتے۔ بس کسی کسی کے سلام کا جواب دے دیتے ہیں، اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو نظر اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں۔ جب ان بزرگ نے اپنا یہ مکاشفہ بیان کیا تو ان عالم دین کو اس مکاشفے کے حوالے سے دل میں تھوڑی سی کھٹک پیدا ہوئی۔

وہ عالم دین فرماتے ہیں کہ جیسے ہی مجھے یہ خیال آیا، ان بزرگ نے فوراً میری طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ نہ! کسی مؤمن سے بدگمانی نہیں کرتے۔ یعنی ان عالم دین کے اس خیال کا بھی ان بزرگ کو فوراً کشف ہوگیا۔ یہ گرچہ ایک مکاشفہ ہے؛ لیکن نصوصِ شرعیہ کے خلاف نہیں، اور چوں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ نبی علیہ السلام اپنی قبرِ اطہر میں حیات ہیں، اسی لیے آپ علیہ السلام کی خدمت میں براہِ راست سلام عرض کیا جاتا ہے اور دور رہنے والے امتی بھی آپ علیہ السلام کی بارگاہ میں اسی لیے درود پاک کے نذرانے پیش کرتے ہیں، لہٰذا ان نصوص کی وجہ سے اس مکاشفہ کو ایک گونہ تقویت مل جاتی ہے۔ چناں چہ عقیدۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جو اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک ایک متفقہ عقیدہ ہے، کی بنیاد پر ہی بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں براہِ راست سلام پیش کرنے کے وقت ہمارے دل میں یہ احساس تازہ رہتا ہے کہ ہم نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خدمتِ نبوی میں حاضر ہونے والوں کے لیے آج بھی وہی آداب ہیں، جو نبی علیہ السلام کے دور میں آپ کی حیاتِ مبارکہ میں تھے۔ چناں چہ ارشادِ ربانی ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (سورۃ الحجرات: ۲)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ ان سے اس طرح بلند آواز میں بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال اکارت ہوجائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔'' اس آیتِ کریمہ کے ذیل میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی حیاتِ مبارکہ میں آپ کے سامنے آوازیں بلند کرنا ممنوع اور خلافِ ادب تھا، آج بھی آپ علیہ السلام کے روضۂ اطہر کے پاس آوازیں بلند کرنا بہت بڑی بے ادبی اور گستاخی ہے، بلکہ ایسا کرنے والوں کے اعمال کے ضائع ہوجانے کا بھی ڈر ہے؛ لیکن آج اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی آدابِ زیارت کی رعایت نہیں کرتے۔

بخاری شریف میں مذکور ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب ؓ کے دور میں دو لوگ مسجد نبوی میں اونچی آواز سے باتیں کررہے تھے، آپ ؓ نے ایک شخص سے فرمایا کہ ذرا انہیں میرے پاس لے آؤ، وہ دونوں جب آپ کے پاس حاضر ہوئے تو دریافت فرمایا کہ (تم دونوں) کہاں سے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ طائف کے رہنے والے ہیں۔ اس پر آپ ؓ نے فرمایا کہ "اگر تم مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں سخت سزا دیتا، کیوں کہ تم مسجدِ نبوی میں اپنی آوازیں بلند کررہے ہو۔"

چناں چہ زیارتِ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آداب بڑے نازک ہیں، لیکن آج اس امت کی طرف سے اس مقدس بارگاہ کی ایسی بے ادبی ہورہی ہے کہ بس اللہ کی پناہ! آوازیں بلند ہوتی ہیں بلکہ مشاہدہ ہے کہ شور شرابا بھی ہوتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھا گیا کہ مسجد نبوی سے ویڈیو کال کرکے وہاں کے مناظر گھر کی خواتین کو دکھلائے جارہے ہیں اور افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ ویڈیو کال کرنے کی دھن ایسی سوار ہے کہ دوسری جانب سے دیکھنے والی گھر کی خواتین نامحرم مردوں کو نظر آرہی ہیں، اس کا بھی خیال نہیں۔

پھر ان بے ادبیوں کا ارتکاب صرف مردوں کی طرف سے ہی نہیں ہے۔ خواتین بھی ان میں برابر کی حد تک مبتلا ہیں۔ گرچہ خواتین کے لیے مسجد نبوی میں نمازوں کی ادائیگی کے لیے علیحدہ جگہیں ہیں اور روضۂ اطہر پر حاضر ہوکر سلام پیش کرنے کے لیے اوقات بھی مختلف ہیں، لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ خواتین آدابِ زیارت کی بالکل رعایت نہیں کررہی ہیں۔ ان کی چیخ و پکار کی آوازیں تو بسا اوقات مردوں تک بھی پہونچ رہی ہیں۔ اللہ معاف فرمائے۔

خواتین کی بات آگئی تو یہ بھی عرض ہے کہ حرمین شریفین کی مقدس سرزمین پر خواتین کی طرف سے ہونے والی بے پردگی اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ یوں لگتا ہے کہ شاید خواتین نے اپنے حق میں پردے کے حکم ہی کو معاف سمجھ لیا ہے۔ صحابیات کی زندگی میں پردہ تھا، تابعات کا اس پر عمل تھا؛ لیکن آج کی خواتین اس میں بہت کوتاہی کرتی ہیں۔ ہوٹل میں ہوں کہ بازاروں میں، راستوں میں ہوں کہ سواریوں میں، حتی کہ مسجد حرام میں، مطاف اور مسعیٰ میں اور مسجد نبوی میں بھی خواتین کی طرف سے پردے پر عمل کرنے میں بڑی کوتاہی ہے۔ پہلے مردوں سے کہا جاتا تھا کہ نگاہیں نیچی رکھیں، عورتوں کے قریب نہ جائیں؛ لیکن آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ عورتوں

سے کہنا پڑے گا کہ آپ مردوں کے قریب نہ جائیں۔کیسی بے حیائی کی بات ہے کہ عورت خود آگے بڑھ بڑھ کر مردوں کو دھکے دے! توبہ توبہ!! ایسی گستاخیاں اور بیت اللہ کے سامنے؟ ایسی بے ادبیاں اور حرمِ نبوی میں؟ ڈرنے کا مقام ہے!

حرمین شریفین کے تقدس کی پامالی دراصل آپ علیہ السلام کی توہین اور بے توقیری ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج صاف محسوس ہوتا ہے کہ نبی علیہ السلام امت سے سخت ناراض ہیں۔چناں چہ اب کی بار دیکھنے میں آیا ہے کہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں سلام پیش کرنے کے لیے بھی وقت تنگ کر دیا گیا ہے۔ اتنا مختصر وقت دیا جا رہا ہے کہ مشکل سے بس نبی علیہ السلام کی خدمت میں جلدی جلدی سلام پیش کیا جا سکے؛ ورنہ تو پہلے قریب کی صفوں میں بیٹھ کر تلاوت بھی کرنے کی سہولت تھی،لیکن پہلے اس سے محروم کیا گیا، پھر سلام پیش کرنے کے لیے ہر نماز کے بعد حاضر ہونے کی سہولت ختم ہوئی، پھر اب وقت اتنا مختصر دیا جا رہا ہے کہ جس میں صرف محبوب علیہ السلام کی خدمت میں سلام پیش کر سکیں، آپ علیہ السلام کے دو محبوب یاروں کی خدمت میں سلام پیش کرنے کے لیے گویا وقت ہی نہیں ہے۔اس کے ظاہری اسباب چاہے کچھ ہوں، اس عاجز کو تو بس یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ محرومی دراصل نبی علیہ السلام کی بے ادبی کے سبب ہے۔

خلاصہ یہ کہ آج حج اور عمروں کی کثرت ہے اور حدیثِ مبارک میں ہے کہ قیامت سے پہلے حج اور عمروں کی بہت کثرت ہوگی؛ لیکن دوسری طرف سرزمین حرمین شریفین کے آداب کی بالکل رعایت نہیں۔تصویر کشی ہے، ویڈیو گرافی ہے، بے پردگی ہے، چیخ و پکار اور شور شرابا ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ ایسے امور میں ابتلا کے بعد حج اور عمرے کی روح اور وہاں کے انوارات و برکات کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا

☆☆☆

درسِ عقائد

اللہ پاک ہر چیز پر قادر ہیں

قسط (۴)

ضبط وترتیب: مفتی سیف اللہ قاسمی صاحب

ایمان کی تکمیل اور عقیدہ کی صحت کے لیے جن باتوں پر کامل اعتقاد اور پختہ یقین ہونا ضروری ہے انہی میں ایک یہ ہے کہ اللہ پاک ہر چیز پر قادر ہیں، وہ جب چاہیں جو چاہیں جیسے چاہیں کر سکتے ہیں، نہ کسی میں ان کو روکنے کی طاقت ہے نہ سوال کرنے کی ہمت، کائنات پر اللہ پاک کا ہی کنٹرول چلتا ہے، کوئی پتہ نہیں جو حکمِ خداوندی کے بغیر ہلے اور کوئی مخلوق نہیں جو مشیتِ خداوندی کے بغیر اپنی جگہ سے جنبش بھی کر سکے۔ پس نظامِ کائنات کی ہر چیز (عزت اور ذلت، مالداری اور مفلسی، زندگی اور موت، گمراہی اور ہدایت بلکہ ہر ذرہ ذرہ) پر اللہ پاک ہی کو قدرت حاصل ہے، اللہ پاک کی ذات عجز واحتیاج سے پاک اور تغیر وزوال سے بالا وبرتر ہے۔ اسی لیے اہل السنّہ والجماعہ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ پاک کامل قدرت والے ہیں، وہ ایسی طاقت اور قدرت کے مالک ہیں کہ کسی بھی چیز میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اللہ پاک کو عاجز کر دے؛ یعنی اللہ پاک کے ارادے (اور فیصلے میں رکاوٹ بن جائے) کسی سے ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ چناں چہ اللہ پاک قرآن عظیم الشان میں فرماتے ہیں: وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (سورۂ آل عمران، آیت: ۲۹) ترجمہ: "اللہ پاک ہر چیز پر قادر ہیں۔" اسی خداوندی قدرت اور طاقت کو سمجھاتے ہوئے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا (سورۂ فاطر، آیت: ۴۴) ترجمہ: "اللہ پاک ایسے نہیں ہیں کہ آسمانوں یا زمین کی کوئی چیز انہیں عاجز کر سکے، بے شک وہ خوب جاننے والے اور بڑی قدرت

استاذ معہد العلوم الاسلامیہ، پلمنیر

والے ہیں" یعنی کائنات کی کوئی قوت ان سے مقابلہ کی مجال نہیں رکھتی!

چناں چہ سورۂ فاطر میں ارشاد فرمایا: مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَ مَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورۂ فاطر، آیت: ۲) ترجمہ: "اللہ پاک لوگوں میں سے جس کو رحمت سے نواز دیں، کوئی اس کو روکنے والا نہیں، اور جسے وہ روک لیں تو کوئی نہیں ہے جو اس کے بعد اسے چھڑا سکے۔ اور وہی ہیں جو اقتدار کے بھی مالک ہیں، حکمت کے بھی مالک ہیں۔"

چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں:

کسی بھی چیز کا درست تعارف حاصل کرنے کے لیے اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ایک مفید نکتہ ہے "تُعرَفُ الأشياءُ بأضدادِها" یعنی "چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔" چناں چہ اس نکتہ پر غور کیا جائے تو قدرتِ خداوندی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے؛ جیسے مثال کے طور پر: ایک طالب علم کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ناکام ہونا کس چیز کا نام ہے، اسے ناکامی کا احساس تک نہیں ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طالب علم کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ امتحان میں بہر حال کامیاب ہوتا ہے۔ یعنی کسی چیز کی نفی کرنا گویا اس کی ضد کو ثابت کرنا ہے؛ چناں چہ اللہ پاک سے عجز کی نفی کرنا دراصل ان کی ہستی کے لیے مکمل قدرت کو ثابت کرنا ہے۔ جیسے قرآن عظیم الشان میں اللہ پاک کا ارشادِ گرامی ہے: لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (سورۃ الکہف، آیت: ۴۹) ترجمہ: "آپ کے پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتے۔" یہاں آیتِ کریمہ میں اللہ پاک سے ظلم کی نفی کی جا رہی ہے اور ظلم کی یہ نفی اللہ پاک کے لیے اپنی ضد (کمالِ عدل) کو ثابت کرتی ہے کہ اللہ پاک اپنے کامل عدل کی وجہ سے کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ بالکل اسی طرح اللہ پاک کے بارے میں یہ کہنا کہ کوئی بھی چیز اللہ پاک کو عاجز نہیں کر سکتی۔ تو اللہ پاک سے عجز کی نفی درحقیقت اللہ پاک کے لیے کمالِ قدرت کو ثابت کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک کامل قدرت والے ہیں کہ کوئی بھی ان کو عاجز نہیں کر سکتا خواہ وہ انسانوں میں سے ہو یا حیوانات میں سے، خواہ وہ جمادات میں سے ہو یا نباتات میں سے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک دعا ہے جس میں آپ قدرتِ الٰہی کا یوں اقرار کرتے ہیں:

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ

(صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء بعد الصلوٰۃ، حدیث نمبر: ۶۳۳۰)

ترجمہ: ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہت اسی کی ہے، اسی کے لیے سب

تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اے اللہ! آپ جسے عطا فرمائیں، اسے کوئی روک نہیں سکتا، اور جسے آپ محروم کر دیں، اسے کوئی دے نہیں سکتا اور نہ آپ کے مقابلہ میں کسی کوشش کرنے والے کی کوشش کارگر ہوسکتی ہے۔

چوتھا عقیدہ:

اللہ پاک کے سوا کوئی معبود نہیں: اللہ رب العزت خالقِ کائنات اور مالکِ ارض وسما ہیں، وہی معبودِ حقیقی اور مسجودِ اصلی ہیں؛ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ"

ترجمہ: "اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا فرمایا"

پس الوہیت ومعبودیت کا سزاوار وہی ایک خالق بے ہمتا ہے، بنابریں اہل السنہ والجماعہ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ پاک کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ خدائی صرف خدا کو سجتی ہے؛ لہٰذا کوئی اور معبود بننے کے لائق نہیں؛ کیوں کہ اللہ پاک ایسے قادرِ مطلق ہیں کہ کوئی انہیں عاجز نہیں کرسکتا، کسی اور میں وہ طاقت اور قدرت نہیں جو اللہ پاک کے پاس ہے تو اب اُنہی کو معبود ہونا چاہیے ان کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہوسکتا۔ عقیدۂ توحید ہی سارے اسلامی عقائد اور دینی مسائل کی اصل واساس ہے، کلمۂ توحید کا بنیادی سبق یہی ہے جس کی طرف تمام انبیاء کرام نے دعوت دی ہے اور یہ توحید الوہیت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عبادت صرف اور صرف اللہ پاک ہی کا حق ہے۔

عقیدۂ توحید کا اثبات اور غیر اللہ کا وسیع مفہوم:

قرآن عظیم الشان میں بیش تر مقامات پر عقیدۂ توحید کا ثبوت، نفی اور اثبات کے طریقہ پر بطورِ حصر نازل ہوا ہے اور یاد رکھیں کہ نفی واثبات کے ذریعے ثبوت بہتر ہوتا ہے بہ نسبت صرف اثبات کے طریقے کے؛ کیوں کہ صرف اثبات کے طریقے سے بات کو پیش کرنے میں کبھی دوسرے احتمالات بھی نکل آتے ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر کوئی کہے کہ "اس گھر میں زید رہتا ہے" تو اس میں احتمال ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہو؛ لیکن اگر یوں کہا جائے کہ "اس گھر میں زید کے سوا کوئی نہیں رہتا" تو اب غیر کی رہائش کا احتمال ختم ہوجائے گا۔

یہاں دو اصطلاح بہت زیادہ استعمال ہوتی ہیں: (۱) "اللہ" (۲) "غیر اللہ"۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک اصطلاح زیادہ استعمال ہوتی ہے؛ لیکن لوگ اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے، پھر اس کی حقیقت بتانے کے لیے مستقل تشریح کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے ہی "اللہ" اور "غیر اللہ" والی اصطلاح کا معاملہ ہے کہ جب بھی "اللہ" یا "غیر اللہ" کا لفظ آتا ہے تو اکثر لوگ ظاہری اعتبار سے نہیں سمجھتے کہ "اللہ" اور "غیر اللہ" کا مطلب کیا ہے؟ ہمارے ذہنوں میں غیر اللہ کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ "وہ جس کی عبادت اللہ کو چھوڑ کر کی

جائے یا اللہ کے ساتھ کی جائے'' لیکن یہ معنیٰ اور مطلب بہت بنیادی اور ابتدائی ہے؛ ورنہ تو ''غیر اللہ'' کا مفہوم بہت وسیع ہے؛ چناں چہ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال یہ ہے کہ اللہ پاک سے مانگنے اور دعا کرنے کے لیے ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں اور اس دوران روپیوں اور پیسوں کا خیال آ رہا ہے تو یہ بھی ''غیر اللہ'' ہے کہ دعا تو اللہ سے مانگی جا رہی ہے؛ لیکن دل میں ''غیر اللہ'' ہے، یاد رکھیں کہ جب تک دل زبان کے مطابق نہیں ہوگا اور زبان دل کی ترجمان نہیں ہوگی تب تک کام نہیں بنے گا، پس اگر دل میں کسی بھی طرح غیر اللہ ہے تو پھر یا اللہ یا اللہ کہنے کا کوئی مطلب نہیں، یہیں سے غیر اللہ کو سمجھ لینا چاہیے کہ جو اللہ کو ماننے والا ہو وہ غیر اللہ سے ہر اعتبار سے دور رہے کہ غیر اللہ نہ معھود فی الخارج ہو (کہ نہ خارج میں کسی غیر اللہ کا کوئی تصور ہو) اور نہ معھود فی الذہن ہو (کہ نہ ذہن میں کسی غیر اللہ کا کوئی تصور ہو) حتیٰ کہ دل میں کسی غیر اللہ کے لیے کسی بھی اعتبار سے کوئی جگہ نہ رہے۔ تب جا کر عبادت اللہ پاک کے لیے خالص ہوگی۔ اسی بات کی تعلیم دی ہے قرآن کریم نے، چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشۡرِكَ بِهٖ (سورۃ الرعد، آیت: ۳۶)

ترجمہ: (آپ کہہ دیجیے کہ) مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کرتا رہوں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں۔

تری ذات لائقِ عز و شاں، تری شان جَلَّ جَلَالُہٗ
کوئی شک ہے اس میں نہ کچھ گماں، تری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

ہے تری ہی صفت بے مثال، ہے ترا کمال ہی ذُوالجلال
کھڑے بے ستوں بھی جو آسماں، تری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

ہے ہر ایک ذرہ جہان کا ترے فیض ہی سے تو جلوہ گر
ہے تو ہی تو خالقِ دوجہاں، تری شان جَلَّ جَلَالُہٗ

تو منزّہ صورت وجسم سے، تو بَری ہے نقص وحدوث سے
ہیں کہاں کس میں یہ خوبیاں، تری شان جلّ جلالُہٗ

(حضرت سید منصور غوری رحمۃ اللہ علیہ)

اَکابِر شناسی

سلسلہ نمبر (۴)

نسبتِ دارالعلوم اور نسبتِ قاسمیت میں فرق

ابوسید محمد اللہ غوری

۱۸۷۶ء کی بات ہے، جب کہ ہندوستان پر انگریز حکمرانی کا عہد شباب تھا، دشمن فرنگیوں نے اسلام کو زک پہونچانے کے لیے ایک چال چلی اور "میلۂ خدا شناسی" کے نام سے شاہ جہاں پور کے قریب ایک مذہبی اجتماع رکھا۔ وقت کے مشہور پادریوں، عیسائی مبلغوں، ہندو پنڈتوں، آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں کو اس میں مدعو کیا گیا اور "میلۂ خدا شناسی" کے دلکش عنوان سے مسلمانانِ ہند کو دعوتِ مناظرہ دی گئی۔ (مجموعہ ہفت رسائل، ص: ۳۶۳) پھر عمداً اس میلے کی نہایت وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی کہ کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوں اور ان کے رُوبرو اسلام پر اعتراضات کر کے اہلِ اسلام کو رسوا اور مسلّماتِ اسلام کو بے بنیاد اور خلافِ عقل ثابت کریں۔

ایسے نازک اور اہم موقع پر دینِ اسلام کی ترجمانی کے لیے مسلمانانِ ہند کی نظر ایک ایسے شخص کی طرف اٹھی، جو بظاہر نحیف و ناتواں تھا لیکن درحقیقت اسلام کی ایک مضبوط چٹان تھا۔ یہ شخصیت بانیٔ دارالعلوم دیوبند، شارحِ فکرِ ولی اللّٰہی، سرخیل علماء کرام، متکلمِ اسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، آپ اپنے چند رفقاء کے ہمراہ اس میلہ میں شریک ہوئے اور اپنی خداداد علمی و کلامی صلاحیتوں سے حقانیتِ اسلام کو بڑے خوبصورت اور دلکش انداز میں اور نہایت مؤثر، جاندار اور طاقت ور طریقے سے ثابت کیا۔ اس مذہبی میلہ کی تفصیل، اس میں پیش کردہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصولی دلائل اور اسلام کے بعض فروعی احکام کے حوالے سے آپ کی بیان کردہ دقیق حکمتوں کا بیان، واقعہ یہ ہے کہ نہایت اہم، چشم کشا اور بصیرت افروز ہے، جس کا مطالعہ دورِ حاضر میں بالخصوص اسلامیات کے ہر طالب علم کے لیے غیر معمولی ترجیحی اہمیت کا حامل ہے۔

چناں چہ اسلام کی حقانیت کے دلائل و براہین، فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ اس کے احکام کی تفصیلات اور عقل و درایت کے معیار پر پوری اترنے والی اس کی حکمت بھری تعلیمات کو ہم تصانیفِ قاسمیہ میں پھیلے ہوئے علومِ قاسمی میں تلاش کر سکتے ہیں۔

آج کی اِس صحبت میں خصوصیت کے ساتھ گفتگو اس پر ہے کہ مناظرہ جیتنے والا بلکہ اسلام کی آبرو رکھنے والا وہ بندۂ خدا اس جلسہ میں پہونچا کیسے؟ اور الہامی علوم کی حامل اس عظیم اور عبقری شخصیت کی زندگی کے دوسرے گوشے بھی آخر توجہ طلب ہیں کہ نہیں؟

آپ کے شاگردوں میں ایک حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، وہ اس سفر شاہ جہاں پور کی روداد اس طرح بیان کرتے ہیں کہ: "شاہ جہاں پور سے اس گاؤں تک جہاں میلہ خدا شناسی تھا، جاتے ہوئے راستہ میں ایک ندی پڑتی تھی، حضرت نانوتویؒ پیدل تھے اور چند رفقاء آپ کے ساتھ تھے، پائجامہ پہنے ہوئے ندی میں اتر گئے، جس سے پاجامہ بھیگ گیا۔ ندی پار کرنے کے بعد لنگی باندھی اور پاجامہ اتار کر نچوڑا اور پیچھے لاٹھی پر ڈال کر، جیسے گاؤں والے ڈال لیا کرتے ہیں تشریف لے چلے (حضرت قاسم نانوتوی۔ حیات اور کارنامے، ص: ۲۳۸)

ہائے! ع

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

پھر جب آپ شاہ جہاں پور پہونچے تو وہاں بھی ایک عامی ہی کی تصویر نظر آتی ہے۔ نہ نعروں کی گونج، نہ ہٹو بچو کا شور، نہ استقبالیوں کا ہجوم، نہ حشم و خدم کا گروہ، بس چند رفقاء ساتھ تھے اور وہ بھی بہ ضرورت علمی!

یہی نہیں، آپؒ کی تواضع اور فنائیت تو دیکھیے کہ شاگردِ رشید مولانا فخر الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق آپ نے وہ رات لوگوں کو بتائے بغیر ہی شہر کے ایک عام سرائے میں گذاری۔ کچھ لوگوں کو خبر ہوگئی تو بہ اصرار اپنے گھر لے آئے اور مہمان نوازی کی سعادت حاصل کی۔ (مجموعہ ہفت رسائل، ص: ۳۶۵، ۳۶۶)

آپ کی فنائیت ہی کے حوالے سے آپ کے چشم دید سوانح نگار اور آپ کے استاذ زادہ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں کہ: "علماء کی وضع عمامہ یا کرتا (جیسی چیزیں) کچھ نہ رکھتے، ایک دن فرمانے لگے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا"۔ میں کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا، جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے، کیا اس میں سے ظاہر ہوئے؟ اور آخر سب کو خاک ہی میں ملا دیا۔ اپنا کہنا کر دکھا دیا! (حالات طیب حضرت مولانا قاسم نانوتوی، ص: ۲۹، ۳۰)

اُنہی کا ایک اور بیان ملاحظہ فرمائیں: لکھتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے اس کمال پر ضبط عنایت فرمایا تھا کہ کبھی کوئی کلمہ خودستائی کا کسی طرح، کوئی صورت رعونت یا خود بینی کی خلوت وجلوت، تنہائی، مجمع، اپنے، بیگانوں میں کبھی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔" (مولانا محمد قاسم نانوتوی، حیات اور کارنامے، ص: ۲۳۸، ۲۳۹)

سبحان اللہ! تواضع اور فنائیت، انکساری اور بے نفسی، سادگی اور خود فراموشی کے ایسے نمونے آسمان نے کم ہی دیکھے ہوں گے!

اس میں شک نہیں کہ حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نادر الہامی علوم ان کی سوانح حیات کا جلی عنوان ہے، اسی طرح عیسائی پادریوں، اور ہندو پنڈتوں سے آپ کے کامیاب مناظرے، تاریخِ اسلامی کا روشن اور قابلِ فخر باب ہے، لیکن کہنا چاہیے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی تواضع اور فنائیت، بے نفسی و بے لوثی، سادگی اور خاکساری، تقوٰی اور للّٰہیت آپ کی حیاتِ مبارکہ کا انتہائی اہم اور قابلِ تقلید باب ہے۔ چناں چہ اس پس منظر میں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مدارسِ عربیہ کی چہار دیواری سے محض درسِ نظامی کی تکمیل کر کے فارغ ہونا، نسبتِ دار العلوم کی تحصیل ہے اور حضرت نانوتویؒ کے دیگر مذکورہ بالا اوصاف کا حامل بننا، نسبتِ قاسمیت!

آج ضرورت ہے کہ سوانحِ قاسمی کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے اور خود کو ان عالی صفات سے آراستہ کرنے کے لیے اُن مشائخ کی بافیض مجالس میں شرکت کی جائے، جن کے فیضانِ صحبت سے حضرت نانوتویؒ ایسے "رشکِ ملائکہ" اور "مرجعِ خلائق" افراد جنم لیتے ہیں۔

علماء کو صحبت صالح کی ضرورت

یاد رکھو کہ صحبت بدونِ علمِ متعارف کے مفید ہو سکتی؛ مگر علم متعارف بدونِ صحبت کے بہت کم مفید ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بہت سے علماء نظر آتے ہیں مگر ان میں کام کے دو چار ہی ہیں، جن کو کسی کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔

دیکھیے گلاب کے پاس رہنے سے مٹی میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اہلِ محبت کے پاس رہنے سے خدا کی محبت اور دین کے ساتھ مناسبت حاصل ہو جاتی ہے۔

حضراتِ صحابہ کرامؓ کو فضیلت صحبت ہی کی وجہ سے ہوئی کہ آج کوئی امام اور فقیہ اور کوئی بڑے سے بڑا ولی، ادنیٰ صحابی کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

(حضرت حکیم الامت تھانویؒ، العلم والعلماء، ص: ۲۵۱)

خُطوط ہائے راہِ مُعرفت

درسِ قصدُ السبیل

(قسط چہارم)

چوتھی ہدایت: پیر بنانے یا بیعت ہونے کا مقصد

تعلیماتِ شریعت کی روشنی میں یہ بات طئے ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں کسی بھی نیک عمل کی پذیرائی اور قبولیت کا دارومدار صرف اور صرف "اخلاص اور حسنِ نیت" پر ہے۔ چناں چہ اسلام نے نیت کی پاکیزگی کو ہر عمل کی روح قرار دیا ہے؛ کیوں کہ اگر نیت میں مصلحت کی آمیزش یا ریا کی دھول شامل ہوجائے تو عمل کے ظاہری نقوش چاہے جتنے بھی خوبصورت ہوں، اس کے روحانی اثرات مٹ جاتے ہیں اور اخروی اجر وثواب ضائع ہوجاتا ہے۔ تصوف وسلوک کا ماحصل اور خلاصہ بھی یہی ہے کہ دل کا آئینہ دنیاوی آلائشوں سے پاک ہوجائے، فکر کی پاکیزگی نصیب ہوجائے، اور سالک کو وصول الی اللہ کی دولتِ سرمدی حاصل ہوجائے۔ مرشد ہو کہ مرید، دونوں کے دلوں میں یہی ایک تڑپ رہنی چاہیے۔

اگر نیتوں میں کھوٹ ہو یا "اللہ" کے بجائے کسی درجہ میں بھی "غیرُ اللہ" مطلوب ہو تو پھر ریاضتیں، مجاہدات، اور چلہ کشی وغیرہ سب کچھ بے سود ہے۔ سالک کو تہی دستی اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اسی لئے سچا سالک اور حقیقی طالب وہی ہے جو اپنے دل کے نہاں خانے کو "ہر طرح کی غیریت" سے پاک کر کے صرف "ذاتِ حق" کی معرفت اور ان کی سچی محبت کا طلبگار رہے۔

منزل سے دوری اور مقصد میں ناکامی کا سبب

راہِ طریقت کے سالکین پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہونی چاہیے کہ کائناتِ عارضی میں کسی بھی چیز کی معرفت اور حقیقت تک رسائی کے دو ہی راستے ہیں: (۱) صواب کی شناخت (۲) خطا سے اجتناب۔ تصوف و

سلوک کے اس نورانی راستے میں قدم رکھنے سے پہلے بھی یہ جاننا ناگزیر ہے کہ بیعت وارادت کے باب میں نیت کا فساد اور مقاصد کی کجی انسان کو کس طرح گمراہی کے اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے۔ ذیل میں ان سات بنیادی مروجہ مغالطوں کا تفصیلی تذکرہ کیا جارہا ہے، جو دورِ حاضر میں طریقت کے مصفیٰ چشموں کو گدلا کرنے کا سبب بنے ہیں اور جن سے دامن بچانا ہر سالکِ راہِ معرفت کے لیے لازم وضروری ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے عموماً سالکینِ راہِ طریقت میں پائے جانے والے غلط مقاصد کی نشان دہی فرمائی ہے جن کو سطور ذیل میں ترتیب وار مع تشریح وتوضیح قلم بند کیا جارہا ہے:

غلط مقاصد:

(۱) صاحبِ کشف وکرامت بننے کا قصد، پہلے بتایا جاچکا ہے کہ یہ چیزیں شیخ میں ہونا بھی ضروری نہیں تو پھر مرید اس کا ارادہ کرکے کیا کرے گا؟ اس لیے بیعت سے اس کا ارادہ فضول ہے۔

تشریح:

بابِ بیعت وارادت کا سب سے بڑا مغالطہ یہ ہے کہ سالک کسی شیخِ کامل کے ہاتھ پر اس نیت سے بیعت ہو کہ وہ منازلِ سلوک طے کرکے، کچھ چلّے کاٹے گا اور شیخ کی توجہِ خاص سے اس پر کشف کے ایسے ابواب کھلیں گے کہ وہ دیوار کے پار دیکھنے اور پانی پر چلنے کے قابل ہوجائے گا، اور شیخ کی نگرانی میں رہ کر آگے چل کر خود خلافت واجازت سے سرفراز ہوگا اور صاحبِ کشف وکرامات ولی بن جائے گا۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ تصوف کا مسلمہ اصول ہے کہ جو چیز (صاحبِ کشف وکرامات ہونا) خود شیخ کے لیے شرطِ ولایت نہیں، وہ مرید کے لیے کیسے مقصدِ حیات ہوسکتی ہے؟ مرید بھلا اس کا ارادہ کرکے کیا پائے گا؟ جب شیخِ کامل کے لیے اس کی شرط نہیں تو مرید کا اس کی تمنا میں سرگرداں رہنا محض ایک لاحاصل جستجو اور فضول تمنا ہے؛ کیوں کہ جو چیز دائرۂ مطالبہ سے ہی باہر ہو تو اس کی تمنا کرنا سوائے ضیاعِ وقت کے اور کچھ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج پیری مریدی کا تقدس اسی کرامت کی دکان داری کی وجہ سے پامال ہوا ہے۔ صبح وشام کرامات کا صادر ہونا تو خود کرامت کے ناقص ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ جو چیز جتنی سستی اور عام ہوجائے، اس کی اہمیت اتنی ہی گھٹ جاتی ہے۔ قدر ہمیشہ نایاب (Rare) شئ کی ہوتی ہے۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ "اگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی کرامات کو یکجا کیا جائے تو شاید ایک صفحہ بھی پُر نہ ہو؛ جب کہ بعد کے دور کے اولیاء کرام کی کرامات پر پوری کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔" اکابر اہلِ علم اور مشائخ عظام سے منقول ہے کہ "کرامات کا بہ کثرت صدور کمال

کی نہیں، بلکہ اس کے تشنہ کام اور ناقص ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔

کشف و کرامت کی حقیقت اور حیثیت کو حضرت تھانویؒ نے ایک دل نشیں مثال سے بھی واضح فرمایا: کہ جیسے دو مسافر ایک ہی ریل گاڑی میں آمنے سامنے بیٹھے سفر کر رہے ہیں۔ ایک مسافر کی طرف کی کھڑکی کھلی ہے، وہ باہر کے تمام مناظر ''شہروں کی رونقیں اور شہری زندگی کا شور شرابا، دیہاتوں کی سادگی اور وہاں کے ماحول کی خاموشی، کھیت کھلیان، سرسبز باغات، دوڑتے حیوانات، اڑتے پرندے'' وغیرہ دیکھتا ہوا اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ دوسرے مسافر کی کھڑکی بند ہے؛ وہ یادِ الٰہی میں مستغرق ہے، سو رہا ہے یا کسی کتاب کے مطالعے میں محو ہے۔ وہ باہر کا کوئی منظر دیکھے بغیر منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

اب غور کیجیے! دونوں مسافر انہی تمام مقامات سے گزرے، لیکن ایک نے طرح طرح کے مناظر دیکھے اور دوسرے نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ تو کیا محض کھڑکی کھلی ہونے اور مناظر دیکھ لینے سے دیکھنے والے کا رتبہ، نہ دیکھنے والے دوسرے فرد سے بڑھ گیا؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو بس آنکھیں کھلی ہونے کا اتفاق ہے، اس میں کونسا کمالِ بزرگی ہے؟

پھر کرامت کے تعلق سے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ کرامت انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ کوئی شیخ چاہے بھی کہ از خود کرامت دکھائے تو وہ کائنات کی ساری طاقت لگا کر بھی ایسا نہیں کر سکتا جب تک کہ اِذنِ الٰہی نہ ہو۔ اور کبھی بلا سوچے سمجھے کوئی خرقِ عادت واقعہ صادر ہو جاتا ہے۔ پس جو شے دائرۂ اختیار سے باہر ہو، اس کے پیچھے پڑنا تو خود اصولِ سلوک کے منافی ہے۔ سلوک کا اصل اصول تو یہ ہے: کہ ''جو تمہارے اختیار میں ہے (جیسے ذکر و مجاہدہ) اسے مضبوطی سے پکڑو، اور جو تمہارے اختیار سے باہر ہے (جیسے کشف و الہام) اس کے پیچھے مت پڑو۔''

ایسے ہی اس کی ایک اور مثال یہ بھی ہے کہ مراقبہ کے لیے نیت کر کے بیٹھنا، یہ تو اختیار میں ہے، لیکن مراقبے کے دوران کسی طرح کے وسوسے یا خطرے کا نہ آنا غیر اختیاری معاملہ ہے۔ کشف و کرامت کی حقیقت اور حیثیت کو سمجھنے کے لیے اتنی بات کافی ہے۔ پس غیر اختیاری چیز کے حصول کے لیے بے جا تگ و دو کرنا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔

(۲) پیر کو بخشوانے کی ذمہ داری دینے کا قصد، یہ بھی بالکل غلط خیال ہے، کوئی کسی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی چہیتی بیٹی سے فرما چکے ہیں کہ ''بیٹی فاطمہ! اپنے کو اعمالِ صالحہ کے ذریعہ جہنم کی آگ سے بچا لے؛ کیوں کہ میں تجھے خدا کی پکڑ سے بچا نہیں سکتا''۔

تشریح:

ایک عام مغالطہ یہ بھی ہے کہ سالک اس خام خیالی کے ساتھ بیعت کا قلادہ اپنے گلے میں ڈالتا ہے کہ کل قیامت کے مہیب دن، جب پیر صاحب اپنے تقویٰ کے طفیل جنت کی طرف گامزن ہوں گے، تو وہ مرید کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں گے۔ یہ عقیدہ سراسر باطل اور مزاجِ شریعت کے خلاف ہے۔ کیوں کہ خدا تعالیٰ کی عدالت میں کوئی کسی دوسرے کی بخشش کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ترجمہ: اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (سورۂ فاطر، آیت: ۱۸)

چناں چہ سالک اور مرید کا اپنے شیخ و مرشد سے نجات اور بخشش کا امیدوار ہونا بھی درست نہیں؛ جب کہ سرورِ کائنات محبوبِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سب سے چہیتی اور لاڈلی بیٹی، جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے (جن کا آپ کھڑے ہو کر استقبال فرماتے، پیشانی چومتے اور انہیں سینے سے لگاتے تھے) صاف فرمادیا تھا:

"اے فاطمہ! اپنے اعمالِ صالحہ کے ذریعے خود کو جہنم کی آگ سے بچالو، میں خدا تعالیٰ کی پکڑ کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔" (صحیح مسلم/ کِتَاب الْإِيمَانِ/ حدیث: ۵۰۳)

جب سیدۂ کائنات کو یہ سبق دیا گیا تو اس کا مقصد دراصل پوری امت کو یہ باور کرانا تھا کہ وہاں ہر شخص کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا ہوگا۔

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ:

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد کلیر شریف تشریف لے گئے اور پیرانِ پیر حضرت خواجہ علاؤالدین صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چلہ کشی کی، لمبا وقت مراقبوں اور اذکار میں گزارا۔ (یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ مزارات اولیاء پر حاضری و مراقبہ نیز ان اولیائے کرام کے فیوضِ باطنی سے استفادہ ایک مستقل اور باریک علمی مسئلہ ہے، جس کی تفصیل اپنے وقت پر آئے گی۔ جب تک کسی مجمل بات کی تفصیل سامنے نہ آئے، اس سلسلے میں کوئی رائے قائم کرنا یا اس کا غلط مطلب نکالنا یا اس سلسلے میں کسی قسم کی عملی پہل کرنا، ہرگز درست نہیں، اس سے بچنا چاہیے)۔ چناں چہ جب حضرت رائے پوریؒ وہاں قیام پذیر تھے، تو لگاتار تین دن مزار سے یہی ندا آئی: "اپنی اپنی کرنی، اپنی اپنی بھرنی۔" حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ صدا سنی تو تڑپ اٹھے اور فرمایا کہ "جب معاملہ اپنے ہی اعمال کا ہے تو پھر رائے پور چلو اور محنت کرو!" معلوم ہوا کہ کوئی کتنا

ہی بڑا قطب یا غوث کیوں نہ ہو، کسی کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی جنت میں لے جانا اس کے بس میں نہیں ہے۔

قرآنِ مجید اسی کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ

ترجمہ: "اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھے گی، اور اس دن سارا اختیار صرف اللہ ہی کا ہوگا۔" (سورۃ الانفطار: ۱۹)

چناں چہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام بھی اگر دربارِ الٰہی میں شفاعت فرمائیں گے تو وہ (ہر عام و خاص یا تارکِ شریعت کے لیے نہیں ہوگی۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ سفارش کرنے والا پہلے یہ دیکھتا ہے کہ سفارش کس کی ہو رہی ہے اور کس کے سامنے ہو رہی ہے۔) انبیاء کرام علیہم السلام بھی شفاعت سے قبل خدا تعالیٰ کا جلال اور اس کی رضا دیکھیں گے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدانِ محشر کی شفاعت کے تعلق سے فرماتے ہیں کہ روایت میں ہے کہ ثُمَّ أَسْتَأْذِنُ عَلَى رَبِّي الثَّالِثَةَ، فَإِذَا رَأَيْتُهُ وَقَعْتُ سَاجِدًا، فَيَدَعُنِي مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَدَعَنِي، ثُمَّ يَقُولُ: ارْفَعْ مُحَمَّدُ، وَقُلْ تُسْمَعْ، وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ، وَسَلْ تُعْطَ. فَأَرْفَعُ رَأْسِي، فَأَحْمَدُ رَبِّي بِثَنَاءٍ وَتَحْمِيدٍ يُعَلِّمُنِيهِ، ثُمَّ أَشْفَعُ (مسند احمد، حدیث: ۱۳۵۶۲)

ترجمہ: (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں) کہ "میں اپنے پروردگار کے پاس حاضری کی اجازت چاہوں گا جو مجھے مل جائے گی، میں اپنے رب کو دیکھ کر سجدہ ریز ہو جاؤں گا، اللہ پاک جب تک چاہیں گے مجھے سجدے ہی کی حالت میں رہنے دیں گے، پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! سر اٹھایئے، آپ جو کہیں گے اس کی شنوائی ہوگی، جو مانگیں گے وہ ملے گا اور جس کی سفارش کریں گے قبول کر لی جائے گی۔"

جب شافعِ محشر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا آغاز بھی ایک طویل تضرع اور سجدے کے بعد اللہ رب العزت کے اِذن سے ہوگا، تو کسی اور پیر و مرشد کی کیا بساط کہ وہ بلا عمل بخشش کی ضمانت لیتا پھرے!!!

چناں چہ ارشادِ ربانی ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا (سورہ فصلت، آیت: ۴۶)

ترجمہ: "جس شخص نے نیک عمل کیا تو اپنے ہی بھلے کے لیے کیا، اور جو شخص برا عمل کرتا ہے تو اسی پر اس کا وبال ہے۔"

اسی طرح آیت کریمہ ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (سورۂ مریم، آیت: ۹۶)

ترجمہ: "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، خدائے رحمٰن ان کے (دلوں میں) محبت پیدا

کردیں گے۔"

قرآنِ پاک میں جہاں بھی ایمان کا تذکرہ ہے، وہاں اعمالِ صالحہ کی قید لازم لگی ہے؛ کیوں کہ اعمالِ صالحہ ہی ایمان کا ناگزیر تقاضا اور اس کی سچی دلیل ہیں۔ محض شفاعت کی امید پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا غفلت کی دلیل ہے۔ اوامرِ الٰہی کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب ہی عملِ صالح ہے۔ صرف چند رکعت نماز پڑھ کر باقی زندگی نفس کے حوالے کردینا عملِ صالح کے دائرے میں نہیں آتا۔

ہمارے مشائخ عظام کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کے حوالے سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے بلکہ لوگوں کو بیعت بھی کرتے ہیں تو اس امید سے کہ شاید کل قیامت میں اللہ پاک کسی مخلص مرید کی برکت سے پیر کی مغفرت فرمادے۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ: "میں اسی واسطے کثرت سے بیعت کرلیتا ہوں کہ شاید کوئی مرید خدا کا مقبول بندہ نکل آئے اور وہ میری نجات کا ذریعہ بن جائے، یا دوزخ کی طرف جاتے ہوئے کسی مرید کو مجھ پر رحم آجائے اور وہ بارگاہِ الٰہی میں میری سفارش کردے۔"

(۳) پیر کی نظر کی تاثیر سے کامل بن جانے کا قصد، یہ بھی غلط خیال ہے؛ کیوں کہ اگر یوں نگاہِ شیخ سے اس طرح کام بن سکتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ کامل نظر کون ہوسکتا ہے؟ پھر صحابہ کرامؓ کا کام آپ کی مبارک نظر سے ہی بن گیا ہوتا، شریعت وسنت کے مجاہدوں کی ضرورت ہی نہ پڑتی، جب ان کا کام محض نبوی نظر سے نہیں بنا بلکہ دین وشریعت پر جمنا پڑا تو ہمارا پیر کیا اپنی نظر سے کامل بنادے گا؟

تشریح:

سالکین کو عموماً ایک مغالطہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شیخ کی توجہ سے کام بن جائے گا۔ گویا وہ اپنے شیخ کو انسان کے بجائے کوئی جادوئی مشین سمجھ لیتے ہیں شاید کہ بس ادھر شیخ صاحب ایک نظر ڈالیں گے یا ایک پھونک ماریں گے اور مرید آن کی آن میں ولی بن جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ شیخ اور مرشد کی توجہ مرید کے حق میں کارگر اور نفع بخش ضرور ہے؛ لیکن اسی وقت جب کہ مرید از خود بدلنا چاہے۔ اور اگر مرید خود بدلنا نہ چاہے، تو دنیا کا بڑے سے بڑا شیخ بھی اسے نہیں بدل سکتا۔

حضرت تھانویؒ کا ارشاد:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص عمرِ نوح پا کر بھی کسی شیخِ کامل کی خانقاہ میں پڑا رہے؛ لیکن خود اپنی اصلاح کا عزم نہ رکھتا ہو تو وہ شیخِ کامل بھی اس کو نہیں سدھار سکتا۔ اس کے برعکس، اگر انسان کے اندر خود سدھرنے کی تڑپ ہو تو وہ انسان تو بڑی چیز ہے، کسی جانور کی کوئی ادا دیکھ کر بھی

عبرت حاصل کرسکتا ہے۔"

ذرا سوچیں کہ اگر محض پیر کی نگاہ سے کام بن جاتا تو مقتدائے عالم، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نگاہِ مبارک سے بڑھ کر کس کی نظر کامل ہوسکتی تھی؟ پھر صحابہ کرامؓ کو شریعت وسنت کے مجاہدات، ہجرتوں اور دیگر مشقتوں اور صعوبتوں کی کیا ضرورت تھی؟ جب ان کا کام بھی محض نبوی نظر سے نہیں (یوں تو اصل کمال نگاہِ نبوت کا بے شک تھا مگر مزاجِ نبوت خود مستقل محنت کا تھا) بلکہ دین پر استقامت اور احکامِ شریعت وسنت کی پابندی سے بنا تو کوئی پیر اپنی ایک نظر سے کسی کو کیسے کامل بنا سکتا ہے؟ اللہ پاک کا قانون یہی ہے کہ انسان اتباعِ شریعت وسنت کے اہتمام سے ہی کامیاب ہوتا ہے۔ شیخ کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ مرید بھی محنت کرے گا تو پھر ان دونوں کی مشترکہ سعی سے اللہ پاک ہدایت کا ثمرہ عطا فرمائیں گے۔

مشائخ کی توجہات:

ہاں! شیخ کی نظر کا اثر اپنی جگہ ہے، اس ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ بعضے لوگ توجہ کو معمولی چیز سمجھتے ہیں، جب کہ مشائخ کی باطنی توجہ کوئی ہلکی چیز نہیں ہے۔ جو اہل اللہ واقعی توجہ دیتے ہیں، ان کی ہڈیاں تک گُھل جاتی ہیں۔ ہمارے حضرت جی قدس سرہ کے شیخ (مرشدِ عالم حضرت مولانا پیر غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ) اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: "میں نے اپنے سالکین پر اتنی توجہات صرف کی ہیں کہ اب میری ہڈیاں بھی دکھتی ہیں۔" چناں چہ ایک مرتبہ کی گہری باطنی توجہ میں اتنی طاقت صرف ہوجاتی ہے جتنی ایک وقت کا کھانا ہضم کرنے میں لگتی ہے۔

مشائخ کی توجہ غیر اختیاری ہوتی ہے:

لیکن یہ بات بھی یاد رہے کہ مشائخ کی توجہ ایک غیر اختیاری چیز ہے، اہلِ حق مشائخ عظام محض اپنے ارادے سے توجہ ڈال کر کسی کو اللہ تک نہیں پہنچاتے؛ بلکہ اس توجہ کے حصول کے لیے بھی مرید کو مسلسل محنت کرنی پڑتی ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے محنت اور عمل کرنے والوں کے تعلق سے فرمایا: فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (سورۃ الزمر، آیت: ۷۴) ترجمہ: "(نیک) عمل کرنے والوں کے لیے بہترین انعام ہے۔"

اسی کو حضرت مجذوب نے فرمایا ؎

کامیابی تو کام سے ہوگی، نہ کہ حسنِ کلام سے ہوگی
ذکر کے التزام سے ہوگی، فکر کے اہتمام سے ہوگی

(۴) ھُوحق، نعرۂ مستانہ اور جوش ومستی کے حصول کا قصد، یہ خیال بھی بے کار ہے، اس لیے کہ اگر ہُو حق سے

آدمی سنور جاتا اور خواہشاتِ نفسانیہ خود بہ خود مغلوب ہو جاتیں، مجاہدہ ومحنت کی ضرورت نہ ہوتی تو اچھا ہی ہوتا مگر عادتاً ایسا نہیں ہوتا، اس لیے اس نیت سے راہِ سلوک میں قدم رکھنا بھی صحیح نہیں ہے۔

تشریح:

یہ خیال بھی سالکِ راہِ طریقت کے لیے بہت ہی نقصان دہ اور خطرناک ہے کہ وہ ذکر کے دوران "ہوحق" کی ضربوں، وجد اور مستی کی کیفیات کو مقصود سمجھ لے، اگر محض ان نعروں سے نفس مغلوب ہو جاتا اور مجاہدے کی ضرورت نہ رہتی تو کتنی اچھی بات تھی؛ مگر عادتاً ایسا واقع نہیں ہوتا۔ اگر محض کسی کے کان میں پھونک مار دینے سے ہی خدا مل جاتا تو ہمارے مشائخ نے خانقاہوں میں اتنی سخت ریاضتیں کیوں کیں؟ انہوں نے نفس کی مخالفت کے اتنے سخت مجاہدے کیوں کیے؟ کیوں دنیا کی لذتوں کو چھوڑا؟ خلوتوں کی ریاضتیں آخر کس وجہ سے برداشت کیں؟ اتنی سخت اور کٹھن محنت کے بعد بھی وہ راتوں کو روتے تھے کہ الٰہی! ہمیں اپنی محبت کے لیے قبول فرمالے! خدا تک پہنچنا اتنا آسان نہیں کہ بس ایک نعرہ مارا اور واصل باللہ ہو گئے۔ لہٰذا جذب ومستی کی لذتیں ہوں کہ ذکر سے حاصل ہونے والی دیگر کیفیتیں، ان کو پانے کے مقصد سے بھی راہِ سلوک میں قدم رکھنا درست نہیں ہے۔

ایک واقعہ:

"ہوحق" کی بات آئی تو بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا کہ عاجز جب کہ بہت ہی کم عمر تھا اور تصوف وسلوک کی بھی کچھ تفصیلات سے آگاہی نہیں تھی، اس وقت ایک بڑے شہر کی جامع مسجد میں دیکھا کہ عجیب وغریب لباس اور دراز زلفوں والے ایک پیر صاحب مجمع لگائے بیٹھے ہیں، لوگ باری باری آتے ہیں اور پیر صاحب ان کے کان میں زور سے "ہو" کہہ کر پھونکتے ہیں۔ اس طرح کی "ہوحق" کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

غیر اختیاری طور پر حاصل ہونے والی کیفیات

لیکن ہاں! دورانِ ذکر اگر غیر اختیاری طور پر کوئی آہ یا نعرہ نکل جائے تو ایسا سالک معذور ہے؛ لیکن قصداً لوگوں کے مجمعے میں بیٹھ کر نعرے بازی کرنا سنت کے خلاف ہے۔ ہم نے اپنے اکابر کو کبھی اس طرح محفلیں گرماتے نہیں دیکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے ہاں باطنی احوال کا بہت اخفاء تھا۔ اور صحیح معنوں میں اللہ پاک کے نام اور اس کے کلام کا وزن تو وہ تھا کہ نزولِ وحی کے وقت اونٹنی بیٹھ جاتی تھی، اور ایک صحابی فرماتے ہیں کہ نزولِ وحی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سرِ مبارک میری ران پر تھا، تو مجھے لگا کہ میری ران کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ یہ ہے

کلامِ الٰہی کا حقیقی اور باطنی وزن! یہ کوئی گانا سن کر سستی مستی کا نام نہیں کہ محفل ختم اور حال غائب۔

ایسے ہی بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ہر وقت مست رہیں، ٹوپی کہیں جا رہی ہو اور کرتا کہیں اور۔ صوفیانہ اشعار پڑھ کر جھومتے ہیں۔ گویا یہ کہتے ہیں "میں مست ہوں جمالِ یار میں"۔ یہ بھی نادانی ہے۔ پہلے یار کا نام لینا تو سیکھ لیں، پھر بعد میں جمالِ یار میں مست ہونے کا مرحلہ ہے۔ ابھی تو یار کی پہچان ہی نہیں اور مستی کا دعویٰ؟

(۵) بے نفسی و بے خودی پیدا ہو جانے کا قصد، یعنی یہ چاہنا کہ کسی صاحبِ تاثیر و تصرف پیر کے ذریعہ اپنی طبیعت کرامتاً بدل جائے، ایک طرح کی محویت اور فنائیت پیدا ہو جائے، گناہ اپنے آپ ہی چھوٹ جائیں، اس کی طرف التفات ہی ختم ہو جائے، وساوس و خطرات بھی فنا ہو جائیں؛ گویا ایک مجذوبانہ کیفیت حاصل ہو جائے؛ اس غرض و مقصد کو عام طور سے لوگ بہت اچھا اور حاصلِ سلوک سمجھتے ہیں؛ لیکن غور کیا جائے تو اگرچہ یہ کیفیت پسندیدہ ہے مگر غیر اختیاری ہے اور غیر مطلوب ہے۔ غور کرنے سے میری سمجھ میں آیا کہ ان کیفیات کی طلب کے پیچھے بھی نفس کا ایک مکر چھپا ہوا ہے اور وہ راحت، لذّت اور شہرت کی طلب ہے؛ کیوں کہ ایسی کیفیات میں یہ تینوں چیزیں حاصل ہیں، جب کہ سالک کو رضائے الٰہی کے علاوہ ہر مقصد کا تارک ہونا چاہیے، پھر اس مقصد سے سلوک میں قدم رکھنے والا سخت آزمائش سے دوچار ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اگر یہ کیفیات مل گئیں تو غلط اعتقاد کی وجہ سے اسی کو تکمیلِ سلوک سمجھ کر اصل کام چھوڑ بیٹھے گا اور اگر نہ مل سکیں تو مایوسی و نامرادی کا شکار ہو کر ترکِ سلوک کر بیٹھے گا، اور ظاہر ہے کہ دونوں حالات نقصان دہ ہیں؛ معلوم ہوا کہ سلوک سے یہ قصد و ارادہ بھی صحیح نہیں ہے۔

تشریح:

سلوک میں ایک غلط ارادہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان یہ چاہے کہ کسی صاحبِ تاثیر پیر و مرشد کی برکت سے اس کی طبیعت کراماتی طور پر خود بہ خود بدل جائے؛ وہ راتوں رات متواضع بن جائے، گناہ خود بہ خود چھوٹ جائیں، گناہوں کی طرف توجہ ہی ختم ہو جائے، اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایک مجذوبانہ کیفیت میں گم ہو جائے۔ چناں چہ عام طور پر لوگ ایسی کیفیت کو صوفیانہ رنگ دے کر حاصلِ سلوک تصور کرتے ہیں۔ چناں چہ دیکھا گیا ہے کہ بعضے لوگ سلوک میں آنے سے پہلے نہایت ٹھاٹھ باٹھ اور بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے، بہترین کپڑے پہنا کرتے تھے، پھر سلوک کی طرف متوجہ ہوئے لیکن مقصود نہ سمجھ پانے کی وجہ سے حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہ ہو گئے، بیوی بچوں کی ذمہ داریاں انجام دینے سے بھاگنے لگے اور لباس کے ہوش سے بیگانہ ہو کر اپنے کو واصل باللہ سمجھنے لگے۔

یاد رکھیے! یہ ملنگ پن اور دنیا داری سے فرار حاصلِ تصوف ہرگز نہیں، اور نہ ہی یہ ہمارا دین ہے۔ دین تو

شریعت کی پابندی، حقوق کی ادائیگی اور کامل ہوش مندی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا نام ہے۔

صفائی ستھرائی مزاجِ شریعت بھی ہے اور مطلوبِ شریعت بھی

دنیا بسا اوقات ظواہر کے فریب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ عوام الناس کی نظر میں تو بزرگی کا معیار یہ بن چکا ہے کہ جو شخص جتنے میلے کچیلے کپڑے پہنے، میلی پوشاک اور پھٹی پرانی ٹوپی اوڑھے، وہ اتنا ہی بڑا ''بابا'' یا ولی ہے۔

لفظ ''بزرگ'' دراصل فارسی زبان کا ہے جس کا سادہ سا ترجمہ ''بڑا'' ہے؛ یعنی جسے ہم مرتبے میں بڑا مانیں، وہ بزرگ ہے۔ مگر افسوس کہ اس بزرگی کی تعریف اب مٹی اور غبار سے اٹی ہوئی حالت کو قرار دے دیا گیا ہے، جو کہ سراسر شریعت اور مزاجِ سنت کے خلاف ہے۔

سنت مطہرہ کا دامن اس قسم کے ظاہری میلے پن سے پاک ہے۔ کائنات کی سب سے طیب و طاہر ہستی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لباسِ مبارک پر کبھی میل کا ایک دھبہ بھی نہیں دیکھا گیا اور روزمرہ غسل فرمانا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسمِ اطہر تو وہ تھا جس سے کبھی کسی نے بدبو کا تصور تک نہ کیا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خصوصی معجزہ عطا فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پسینے سے خوشبو پھوٹتی تھی۔ جب فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادنیٰ غلاموں (مشائخِ حق) کے پسینے سے خوشبو آسکتی ہے، تو خود صاحبِ مقامِ محمود صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطر بیزی کا کیا عالم ہوگا!

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت امِ سُلیم رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف فرما تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسینہ مبارک آیا۔ اس پسینے سے اس درجے کی لافانی خوشبو مہک رہی تھی کہ حضرت امِ سلیم رضی اللہ عنہا نے (اس زمانے کی) کسی شیشی میں اس کے قطرات کو جمع کر لیا۔ وہ عطرِ نبوت ایسا مشک بیز تھا کہ بعد میں وہ اسے اپنی دلہنوں کو بطورِ خوشبو لگایا کرتی تھیں۔ (صحیح مسلم/کتاب الفضائل/حدیث: ۶۰۵۵)

پس، شریعت و طریقت کا تقاضہ صاف ستھرا اور باوقار رہنا ہے، نہ کہ مجذوبانہ کیفیت طاری کر کے خود کو عجیب و غریب لباس کا اسیر بنا لینا اور اسے ولایت سمجھنا۔

سنتِ رسول دلیل ہے نہ کہ حال:

یہاں سلوک کا ایک سنہری اور ابدی اصول یاد رکھنا ناگزیر ہے: کہ ''بڑوں کا حال'' (کیفیت) دلیل نہیں ہوتا، بلکہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ''سنت'' دلیل ہے۔'' اگر تاریخِ تصوف یا سوانحِ اکابر میں ہمیں کسی بڑے پیر یا جلیل القدر صحابی کا کوئی ایسا واقعہ ملے جو بہ ظاہر فقرِ شدید یا خرقِ عادت پر مبنی ہو، تو وہ ان کا ''حال'' تھا، جو غیر

اختیاری طور پر ان پر طاری ہو گیا تھا۔ اسے اختیاری طور پر اپنا کر سنت کا متبادل نہیں بنایا جا سکتا۔

جیسا کہ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا صدیقِ اکبرؓ کی اہلیہ محترمہ نے میٹھا کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ ہمارے پاس اتنی جمع پونجی نہیں، تم دیکھ لو اگر کچھ انتظام ہو سکے۔ انہوں نے روزمرہ کے خرچ میں سے تھوڑی تھوڑی کٹوتی کر کے کچھ پیسے جمع کیے اور میٹھا تیار کر لیا۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو معلوم ہوا تو آپؓ نے فرمایا: ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیت المال سے جو وظیفہ مجھے ملتا ہے، وہ میری اصل ضرورت سے اتنا زائد ہے کہ اس میں میٹھا بن سکتا ہے۔'' آپؓ نے فوراً بیت المال کو خط لکھ کر اپنے وظیفے میں سے اتنی رقم ہمیشہ کے لیے کم کروا دی۔ (اشہر مشاہیر الاسلام: ترجمہ: ابوبکر الصدیق، زھدہٗ وورعہ، ج:۱، ص ۹۳، بحوالہ خلیفہ اوّل کی باتیں)

اسی طرح وصال کے وقت آپؓ کا یہ فرمانا کہ: ''مجھے نئے کپڑے میں کفن نہ دینا، نئے کپڑے کے حقدار زندہ لوگ ہیں، مجھے میرے پرانے لباس ہی میں رخصت کرنا۔'' إِنَّ الْحَيَّ أَحَقُّ بِالْجَدِيدِ مِنَ الْمَيِّتِ

(صحیح البخاری/ کتاب الجنائز/ حدیث: ۱۳۸۷)

غور کیجیے! حضرت صدیقِ اکبرؓ کا یہ عمل ان کا ایک مخصوص ''حال'' اور غیر اختیاری کیفیت تھی جو ان کے رفیع الشان مزاجِ فقر کے تابع تھی۔ اگر یہ عمل سنتِ لازمہ ہوتا، تو دیگر صحابہ کرامؓ بھی صدیقِ اکبرؓ کی اتباع میں ایسا ہی کرتے۔

جب کہ دوسری روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کتان (اعلیٰ درجے کے سوتی کپڑے) سے اپنی ناک صاف کی اور خود ہی اپنے نفس کو مخاطب کر کے (عربی میں) فرمایا: بَخٍ بَخٍ أَبُو هُرَيْرَةَ (واہ واہ ابو ہریرہ! کیا شان ہے تمہاری)۔ (پھر اپنے ماضی کو یاد کر کے فرمایا) کہ ایک وہ دور تھا جب میں مسجد نبوی میں بھوک کی شدت سے بے ہوش ہو کر گر جاتا تھا اور لوگ مجھے دیوانہ سمجھ کر میری گردن پر پاؤں رکھ کر گزر جاتے تھے، اور آج تمہارا یہ حال ہے کہ تم کتان کے قیمتی کپڑے سے ناک صاف کر رہے ہو!

(صحیح البخاری/ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ/ حدیث: ۷۳۲۴)

واقعۂ مذکورہ سے یہ نکتہ بہ وضاحت سمجھ میں آتا ہے کہ اگر قیمتی یا اچھے کپڑے کا استعمال بزرگی یا سنت کے خلاف ہوتا، تو سیدنا ابو ہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کبھی ایسا نہ کرتے۔ یہ دراصل انسان کے مزاج پر منحصر ہے۔

''حال'' سنت نہیں ہوتا، سنت تو رسول اللہ ﷺ کا دائمی عمل ہے۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جب قیمتی اور بیش بہا چادریں پیش کی جاتیں، تو آپ ﷺ انہیں زیب تن فرماتے۔ اگر اچھا اور قیمتی لباس پہننا تقویٰ کے خلاف ہوتا، تو آپ ﷺ کبھی اسے قبول نہ فرماتے۔ ہاں، جو چیز شریعت کے مزاج کے خلاف ہوتی، آپ

ﷺ فوراً اس پر رد فرما دیتے۔ جیسے ایک مرتبہ نماز کے بعد آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ یہ جو بیل بوٹوں اور نقش ونگار والا پردہ تم نے لٹکایا ہے، اس نے میری نماز کے خشوع میں فرق ڈالا، اسے یہاں سے ہٹا دو۔ (صحیح البخاری/کتاب اللباس/حدیث: ۵۸۱۷)

لہٰذا، معیارِ حق صرف سنت ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اچھا کھاتا اور اچھا پہنتا ہے، تو اسے حضرت صدیقِ اکبرؓ کے احوال کا طعنہ دے کر دین کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو چیز غلط ہے اسے غلط کہو، اور جو صحیح ہے اسے اختیار کرو۔

نفس کے مکر وفریب کو سمجھیں!

بہت سے سالکین یہ تمنا لے کر آتے ہیں کہ ان کے دل سے تمام وساوس اور خطرات یک لخت فنا ہو جائیں اور ان پر ایک ایسی مجذوبانہ کیفیت طاری ہو جائے کہ انہیں دنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہے۔ اگرچہ باطنی صفائی ایک پسندیدہ شئ ہے، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایسی مخصوص کیفیات کا طاری ہونا ''غیر اختیاری'' بھی ہے اور ''غیر مطلوب'' بھی۔ یعنی شریعت کا مرید سے اس بات کا کوئی مطالبہ نہیں ہے کہ وہ لازماً صاحبِ کیفیت بنے۔

اگر حقیقت حال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کیفیات کی طلب کے پیچھے بھی نفس کا ایک مکر اور خفیہ چال چھپی ہوتی ہے۔ نفس دراصل اس مجذوبیت اور فقر کے لبادے میں ''راحت، لذت اور شہرت'' کا طالب ہوتا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ ایک ملنگ کی طرح نظر آئے، لوگ اسے دیکھ کر کہیں کہ ''دیکھو! کیسا اللہ والا ہے کہ کپڑوں کا بھی ہوش نہیں!'' اس تعریف اور فقیرانہ شان میں بھی نفس ایک گہری باطنی لذت کشید کر رہا ہوتا ہے۔

جب کہ حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ عبادت کی لذت کا طالب ہونا بھی غیرِ حق (اللہ کے علاوہ کسی اور چیز) کا طالب ہونا ہے۔ جب مرید کہتا ہے کہ ''حضرت! ذکر میں مزہ نہیں آ رہا''، تو گویا وہ اللہ پاک کا نہیں بلکہ مزے اور کیفیت کا طالب ہے۔ تصوف کا خلاصہ تو ''ترکِ لذات'' ہے، یعنی کیفیات کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اپنے کام (اطاعت) میں لگے رہنا۔ اگر میلے کپڑوں میں نفس کو لذت مل رہی ہے، تو آپ عبداللہ (اللہ کے بندے) نہیں بلکہ عبدالنفس (نفس کے بندے) ہیں۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ آپ اچھے کپڑے پہن کر عاجزی اختیار کرتے۔

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ خانقاہ جانے لگے، تو اہلیہ محترمہ نے دیکھا کہ کرتا پیچھے سے تھوڑا پھٹا ہوا ہے۔ اس زمانے میں کپڑوں میں پیوند لگانا ایک عام سی بات تھی۔ اہلیہ نے عرض کیا کہ کرتا بدل لیجیے۔ حضرت نے فرمایا کہ جلدی ہے، چھوٹی سی بات ہے، بعد میں دیکھ لیں گے۔ اہلیہ نے (جو خود حضرت

ہی کی تربیت یافتہ تھیں) ایک جملہ کہا: ''حضرت! اگر کوئی مرید آپ کا یہ پھٹا ہوا کرتا دیکھ کر آپ کو غریب سمجھے اور کپڑے کا پورا تھان ہدیہ کر دے، تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟'' حضرت تھانویؒ تڑپ اٹھے اور فرمایا کہ تم نے بہت بڑی حقیقت کی طرف توجہ دلائی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے میں نے سفر اور مجالس کے لیے ہمیشہ اچھے، صاف ستھرے، باوقار اور خوش لباس بنوائے تاکہ کوئی مجھے محتاج سمجھ کر ہدیہ نہ دے۔

ہدیہ محبت کی بنا پر دیا جاتا ہے نہ کہ ضرورت کی بنا پر

صفتِ استغناء اور مخلوق سے بے نیازی کو سمجھنے کے لیے یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ جب ممبئی کے ہسپتال میں دل کے عارضے کے بڑے آپریشن کے بعد صحت یاب ہوئے، تو دنیا بھر سے آپ کے شاگرد اور متوسلین ہسپتال میں حاضر ہو کر بڑی رقمیں بطورِ ہدیہ پیش کرنے لگے۔ حضرت کے صاحبزادگان خاموش رہے، لیکن جب حضرت کو کامل ہوش آیا، تو حضرت نے ہدیہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ جب وجہ پوچھی گئی تو اس مردِ حق نے (تربیت کا نچوڑ بیان) فرمایا: ''لوگ اس وقت مجھے جو ہدیہ دے رہے ہیں، وہ مجھے حاجت مند اور مجبور سمجھ کر دے رہے ہیں، اس لیے میں نہیں لے سکتا۔ ہدیہ محبت کی بنیاد پر دیا جاتا ہے، ضرورت اور رحم کی بنیاد پر نہیں۔'' یہ ہے وہ استغنا اور غیرتِ ایمانی جو سچی خانقاہی تربیت سے پیدا ہوتی ہے۔

پس سالک کو رضائے الٰہی کے علاوہ ہر مقصد سے اپنا دامن خالی کر لینا چاہیے۔ دل کی گہرائیوں سے صرف اس ایک نکتہ پر جینا چاہیے: لا مطلوبی الا اللہ، لا مقصودی الا اللہ (اللہ پاک کے سوا میرا کوئی مطلوب و مقصود نہیں)۔

کیفیات وخلافت کا حصول مقصدِ سلوک نہیں

جو شخص کیفیات اور کشف کی نیت سے اس راہ میں قدم رکھتا ہے، وہ سخت آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔ اگر اسے وہ کیفیات (غلط عقیدے کی بنا پر) حاصل ہو جائیں، تو وہ اسی کو سلوک کی تکمیل سمجھ کر اصل کام (نماز، شریعت، ذکر) ہی چھوڑ بیٹھتا ہے۔ لوگ اسے پہنچا ہوا ولی سمجھ رہے ہوتے ہیں اور وہ نماز تک سے غافل ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! جو نماز کا تارک ہو، وہ کبھی اللہ کا ولی نہیں ہو سکتا؛ الا یہ کہ اس کی عقل ماری گئی ہو یا وہ پاگل اور مجذوب ہو گیا ہو۔

حضرت تھانویؒ کا ایک زریں قول ہے کہ: ''مجذوب گو مقبول ہے، مگر قابلِ اتباع نہیں ہے۔'' اتباع صرف اس کی کی جائے گی جس کے ہوش وحواس ٹھکانے ہوں اور جو شریعت پر قائم ہو۔ حضرت رابعہ بصریہؒ اور

حبیب عجمیؒ جیسے بڑے بڑے مجذوبین گزرے ہیں، مگر وہ کبھی مسندِ ارشاد پر نہیں بیٹھے۔ اگر کوئی ان کے پاس آتا بھی تو وہ اسے منع فرمادیتے کہ تم ہماری نقل نہیں کرسکتے۔ صوفیانہ نظام میں قطب اور ابدال کا مرتبہ بھی ان مشائخِ ارشاد کے تابع ہوتا ہے جو لوگوں کی تربیت کا ہوش مندانہ کام کرتے ہیں۔

اگر سالک کو وہ کیفیات نہ مل سکیں، تو وہ مایوسی اور نامرادی کا شکار ہوکر سلوک ہی چھوڑ دیتا ہے۔ راہِ خدا میں چلتے چلتے بیٹھ جانے والے اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ سوچ کر آتے ہیں کہ ایک سال میں مجھے یہ مقام مل جائے گا اور دو سال میں وہ کیفیت آجائے گی۔

سچی نیت یہ ہے کہ پچاس سال کی محنت کے بعد بھی اگر کوئی کیفیت محسوس نہ ہو، تب بھی کوئی پرواہ نہیں۔ اگر موت کے وقت خاتمہ ایمان پر ہوگیا، تو پوری زندگی کی دوڑ دھوپ کامیاب ہوگئی۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ چالیس سال تک راتوں کو رو رو کر ''یارب، یارب'' پکارتے رہے، مگر باطن میں غیب سے ہمیشہ ''لا، لا'' (نہیں، تمہاری پکار قبول نہیں) کا جواب آتا رہا۔ ان کے خادم نے ایک دن تڑپ کر کہا: ''حضرت! آپ کب تک اس دروازے پر مشقت اٹھائیں گے جہاں سے صرف ''لا'' کا جواب آتا ہے؟'' ان بزرگ نے رو کر فرمایا: ''میاں! اگر کوئی اور دروازہ ہو تو بتادو، میں وہاں چلا جاؤں۔ میرے پاس اس چوکھٹ کے سوا کوئی دوسرا ٹھکانہ ہی نہیں!'' اسی وقت غیب سے ندا آئی: ''لبیک عبدی!'' (اے میرے بندے، ہم حاضر ہیں، مانگ کیا مانگتا ہے!)۔ اللہ پاک بندے کا یہی عزم اور استقامت دیکھتے ہیں کہ وہ کتنا جما رہتا ہے۔

آٹھ دس سال یا پندرہ بیس سال سلوک میں گزارنے کے بعد اگر سالک کے دل میں یہ خیال آئے کہ ''شیخ کی محبت کی نظر مجھ پر کیوں نہیں پڑ رہی، یا مجھے خلافت کیوں نہیں مل رہی''، تو یاد رکھیے کہ یہ خلافت کی حرص ہے۔

ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ: ''راہِ سلوک میں خلافت کا خیال دل میں لے آنا بھی طریق کا شرک ہے۔'' ہر وہ چیز جو اللہ پاک کی ذات سے ہٹ کر ہے، وہ غیر اللہ ہے۔ جب مرید کا دل خلافت، کیفیات یا کرامات کی تمنا سے پاک ہوکر صرف ذاتِ حق پر فدا ہوجاتا ہے، تبھی وہ سچے معنوں میں توحیدِ طریقت یعنی ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' کی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے۔

(۶) عملیات وتعویذات سیکھنے کا قصد، یعنی پیر صاحب کی عملیات اور تعویذات اور مقبول دعاؤں سے اغراضِ دنیویہ پوری ہوجائیں گی، مصائب دور ہوجائیں گے، مقاصد حاصل ہوجائیں گے، یا ہم خود ان کی صحبت وقربت سے ان امور کے ماہر ہوکر لوگوں میں مقبول ومشہور ہوجائیں گے، وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ محض دنیا طلبی ہے اور دنیا طلبی کا سلوک سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اس لیے یہ نیت بھی نہایت بُری نیت ہے۔

تشریح:

راہِ سلوک کا مسافر جب تصوف کی چوکھٹ پر قدم رکھتا ہے، تو بعض اوقات اس کا مقصد تصفیۂ قلب کے بجائے دنیاوی مصائب سے نجات، سستی شہرت، یا پیر صاحب سے عملیات وتعویذات کے اسرار سیکھنا ہوتا ہے۔ یہ نیت خالصتاً ''دنیا طلبی'' ہے، جس کا تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اہل اللہ اور مشائخ عظام کے ہاں سلسلوں کے اوراد و وظائف اور معمولات کا تسلسل ان کے اسلاف سے نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آتا ہے۔ ان معمولات پر دوام، تقویٰ کی برکت اور مستقل مزاجی کے سبب اللہ تعالیٰ ان کے کلام اور دم میں اثر پیدا فرما دیتے ہیں۔ چناں چہ بوقتِ ضرورت یا شدید مجبوری کے تحت، وہ بطورِ علاج کسی پر دم کر دیتے ہیں یا تعویذ لکھ دیتے ہیں اور سائل کو شفا حاصل ہو جاتی ہے، مگر وہ اسے اپنا مستقل پیشہ یا دکان داری نہیں بناتے۔

اگر وہ ایسا کرتے بھی ہیں، تو شریعت کے دائرے میں رہ کر اپنے شیخ کے حکم یا کسی خاص مصلحت کے تحت کرتے ہیں۔

آج کل جس سستی شہرت، روزمرہ کے پیشے اور ہجوم کے تصور کو ''عملیات کی دنیا'' کہا جاتا ہے، خانقاہی نظام اور مشائخِ حقہ کا اس سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر کوئی شخص اس نیت سے شیخ اور پیر کی صحبت اختیار کرتا ہے کہ وہ بھی یہ فن سیکھ کر لوگوں میں مقبول و مشہور ہو جائے، تو یہ خالص ''دنیا طلبی'' ہے۔ سلوک تو نام ہی آخرت کو سنوارنے اور دنیا کو دین کے سانچے میں ڈھالنے کا ہے۔ انسان کی چوبیس گھنٹے کی زندگی یعنی اٹھنا بیٹھنا، جینا مرنا سب کچھ اللہ پاک کے حکم اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق گزارنا ہی تصوف کا اصل مقصد ہے، اور اس میں دنیاوی غرض کی آمیزش گویا پورے سفر کو غارت کر دیتی ہے۔ اس لیے اس طرح کی فاسد نیت اور غلط ارادے سے باز رہنا چاہیے۔

(۷) انوار دکھائی دینے اور آوازیں سنائی دینے کا قصد، بعض لوگوں کے ذہن میں پیری کا یہی مطلب ہے کہ کچھ دن ذکر و شغل اور مجاہدات کریں گے تو انوارات کا مشاہدہ ہونے لگے گا اور کچھ باتیں غیب سے سنائی دینے لگیں گی؟ سو یہ بھی فریبِ محض ہے اور سلوک کے مقاصد میں سے نہیں ہے، اولاً تو ان کیفیات کا تعلق خود انسان کے دماغ سے ہوتا ہے، عالمِ غیب سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور اگر عالمِ غیب سے بھی ظاہر ہوں تو اس کا اس سے کیا فائدہ ہے؟ قربِ الٰہی کا تعلق تو اتباعِ شریعت سے ہے، کچھ دکھائی دینے، سنائی دینے سے اس کا کیا تعلق؟ دیکھو! شیاطین کو ملائکہ نظر آتے ہیں مگر وہ شیطان کے شیطان ہی رہتے ہیں۔

تشریح:

کچھ لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ بیعت ہونے کے بعد ذکر اور مراقبہ کے لیے مصلے پر بیٹھتے ہی رنگ برنگی روشنیاں چمکیں گی، غیبی آوازیں آئیں گی اور وہ ہوا میں اڑنے لگیں گے۔ یہ سب نظر کا دھوکا اور نفس کا فریب ہے۔

اولاً، مراقبے میں سفید، سبز یا مختلف روشنیوں کا نظر آنا یا ہوا میں اڑنے کا احساس ہونا اکثر اوقات روحانیت سے نہیں بلکہ دماغی خشکی اور اعصابی کمزوری سے تعلق رکھتا ہے۔ جب دماغ کی اپنی بتی گل ہونے لگتی ہے، تو باہر روشنیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ایک صحت منداور نارمل دماغ کا انسان متوازن رہتا ہے، جب کہ ذہنی تناؤ یا خشکی کا شکار فردان خیالات کو غیب کا مشاہدہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ ایسی صورت میں کسی روحانی عامل کے بجائے رات کو سر میں تیل لگانے، صبح بادام کا مغز کھانے یا کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ثانیاً، بالفرض اگر یہ کیفیات عالمِ غیب سے بھی ہوں، تو ان سے قربِ الٰہی کا کوئی تعلق نہیں۔ شیطان بھی فرشتوں کو دیکھتا ہے، ابوجہل اور ابولہب نے تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسنِ جہاں آرا کا ظہورِ قدسی اپنی آنکھوں سے دیکھا، مگر وہ شقاوت کے اندھیروں سے نہ نکل سکے۔ قربِ الٰہی کا واحد معیار اتباعِ شریعت ہے۔

غیب کی حقیقت کیا ہے؟

غیب اور عالمِ غیب کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ غیب صرف وہ ہے جو اس وقت ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو۔ مثال کے طور پر اورنگ آباد میں بیٹھے شخص کے لیے ممبئی غیب ہے، مگر وہ وہاں جا چکا ہو تو اس کا راستوں سے واقف ہونا اسے ''عالم الغیب'' نہیں بنا دیتا۔ اسی طرح موت کے بعد کے احوال (قبر، حشر، جنت و دوزخ) ہمارے لیے غیب ضرور ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخبرِ صادقہ کے بعد ہمارا ان پر یقین دیکھنے سے بڑھ کر ہے۔

اسی لیے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''اگر میرے سامنے سے حجابات ہٹا کر جنت اور دوزخ کو ظاہر بھی کر دیا جائے، تب بھی میرے یقین میں ایک ذرّے کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غیبی امور سے واقف ہونا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشاہدہ تھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھایا گیا، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (معاذ اللہ) ذاتی طور پر عالم الغیب کہنا درست نہیں ہے۔ الغرض، خواب میں زیارت ہونا یا نہ ہونا فضیلتِ کلی کی دلیل نہیں؛ عین ممکن ہے کہ ایک مرید خواب میں کثرت سے زیارت کرتا ہو اور شیخ کو یہ موقع نہ ملا ہو، مگر مقام و مرتبہ میں پیر، پیر ہی رہے گا اور مرید، مرید ہی۔ فضیلت کا مدار صرف اور صرف تقویٰ اور شریعت پر استقامت ہے۔

صحیح مقصد:

غرض! بیعت کرنے کی مذکورہ بالا اوران جیسی تمام نیتیں اور مقاصد باطل اور فاسد ہیں، اس لیے طالبِ حق کو چاہیے کہ ان سب خیالاتِ فاسدہ اور بے مقصد ارادوں کو ترک کر کے محض رضائے الٰہی کی نیت اور قربِ خداوندی کے قصد وارادے سے اس متبعِ شریعت وسنت شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دے، یعنی بیعت ومعاہدہ کر کے اس کی نگرانی وہدایت میں کام کرنا شروع کر دے، شیخ سے شریعت وسنت کی تعلیم لیتا رہے، اوراس تعلیم کے موافق عمل کرتا رہے، اوراس پر استقامت ومداومت کے طریق معلوم کر کے پھسلنے وبھٹکنے سے بچتا رہے۔

پیر کی طرف سے قربِ الٰہی کے طریقوں شریعت وسنت اور دوامِ ذکر کی راہ نمائی کا اور مُرید کی طرف سے اس راہ نمائی کے مطابق فکر وتوجہ کے ساتھ عملی جدوجہد کرتے رہنے کا عہد ہی پیری مریدی کہلاتا ہے، خواہ کوئی کرشمہ کرامت ظاہر ہو یا نہ ہو مقصود تو ضرور حاصل ہوجائے گا اور وہ ہے رضائے الٰہی، اوراس کا ثمرہ آخرت کی کامیابی اور جنت کا حصول ہے؛ اگرچہ یہ چیز آدمی کو معروف بیعت کے بغیر بھی شریعت وسنت کی پابندی اور ذکر پر مداومت سے حاصل ہوسکتی ہے مگر نفسیاتی طور پر کسی سے بیعت ہوجانے کا یہ فائدہ ہے کہ پیر کو بھی مُرید کی راہ نمائی اور ترقی کی طرف توجہ زیادہ ہوجاتی ہے اور مُرید کو بھی اس معاہدہ کا پاس واحساس راہِ خدا میں جمے رہنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے؛ نیز ایک وقت میں کسی متعین اور واحد شیخ ہی سے وابستہ رہنے کا بھی بس یہی فائدہ ہے جو مذکور ہوا، بس اس حکمت سے اس کا حکم دیا جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ پیر اور مُرید کے درمیان نبی کریم ﷺ کی شریعت پر چلانے اور چلنے کے معاہدہ کے علاوہ بیعت کی اور کوئی حقیقت نہیں ہے، باقی ہر دو کا ہاتھ میں ہاتھ دینا یا عورتوں کو کوئی کپڑا پکڑوا دینا وغیرہ یہ بزرگوں کا ایک صالح اور پسندیدہ عمل ہے کچھ ضروری نہیں ہے۔

تشریح:

الغرض مذکورہ بالا تمام فاسد نیتوں کو مٹا کر، صرف اور صرف اللہ پاک کی رضا اور خوشنودی کے لیے کسی متبعِ سنت شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی حقیقی بیعت وارادت ہے۔ جیسے ہر چیز کا ایک طبعی خاصہ ہوتا ہے (مثلاً دھوپ میں پسینہ آنا تو بالکل اسی طرح) پیری کا بھی ایک خاصہ ہے۔ جب کوئی واقعی پیر بنتا ہے تو مریدین عقیدت میں اس کی جوتیاں اٹھاتے اور دست بوسی کرتے ہیں۔ یہ اس منصب کا فطری اثر ہے، اسے دیکھ کر الجھن یا اعتراض میں نہیں پڑنا چاہیے۔

البتہ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تصوف وسلوک کی دنیا میں دو لفظ نہایت اہم ہیں، جن کے فرق کو سمجھنا ازبس ضروری ہے: (۱) پیر (۲) مصلح۔

پیر: وہ ہوتا ہے جس کو انسان اپنا ''بڑا'' بناتا ہے۔
مصلح: وہ ہوتا ہے جس کے سامنے انسان خود ''چھوٹا'' بنتا ہے۔

کسی کو بڑا بنا کر اس کے نام کی چھتری تلے خود کو معزز ظاہر کرنا بہت آسان ہے۔ دنیا بھر میں یہ کہتے پھرنا کہ ''فلاں حضرت میرے پیر ہیں'' کوئی کمال نہیں، بلکہ اگر ان سے اصلاحی و تربیتی تعلق نہیں اور اپنے نفس کو مٹا کر ان کے سامنے نہیں بیٹھے، تو یہ پیری مریدی محض ایک رسم اور بدعت ہے۔ حضرات صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو صرف بڑا نہیں مانا تھا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنا مصلح بنا کر اپنی روحانی بیماریوں کا علاج کروایا تھا۔ کام بڑا بنانے سے نہیں، چھوٹا بننے اور فنا ہونے سے چلتا ہے۔

شریعت و طریقت کی حقیقت

دوسری بات یہ کہ شریعت اور طریقت دو الگ حقیقتیں نہیں، بلکہ ایک ہی شمع کے دو نام ہیں۔ سر کے بال سے لے کر پیر کے ناخن تک سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نمونہ بن جانا ہی شریعت کو زندہ کرنا ہے۔ اور اس شریعت پر جم جانے کے لیے جب کسی مصلح کا دامن تھاما جاتا ہے، اور اس کی نگرانی میں چلا جاتا ہے تو اس چلنے کے عمل کو طریقت کہتے ہیں۔

چناں چہ شریعت مخدومہ ہے اور طریقت اس کی خادمہ۔ اسے یوں سمجھیں کہ شریعت نماز ہے اور طریقت وضو ہے۔ وضو کے بغیر نماز ممکن نہیں، لیکن اصل مقصود نماز ہے، وضو بذاتِ خود مقصود نہیں۔ طریقت کا سارا خانقاہی نظام، بیعت اور مجاہدے صرف اس لیے ہیں کہ جب موت کا وقت آئے اور فرشتے ہمارے وجود کو ٹٹولیں، تو:

ہمارا دماغ علمِ الٰہی سے بھرا ہوا ہو،
ہمارا دل عشقِ الٰہی سے بھرا ہوا ہو،
اور ہمارا جسم سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سجا ہوا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ علم کے بغیر تصوف محض جہالت اور گمراہی ہے۔

اہل اللہ کو ''اہلِ دل'' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مردہ دلوں کو زندہ کر کے حقیقی دل بناتے ہیں۔ صاحبِ دل (دل رکھنے والے) تو سبھی ہیں، مگر فرق ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص شادی کی استطاعت رکھنے کے باوجود غیر شادی شدہ ہو اور دوسرا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو۔ عام انسانوں کے دل صرف خون کی گردش کے لیے دھڑکتے ہیں، جب کہ اہل اللہ کے دل مسبّب الاسباب کے عشق میں ''اللہ اللہ'' پکارتے ہیں۔ ان کے قلوب کی تپش اور آہوں

سے لاکھوں دلوں کی دنیا بدل جاتی ہے۔

اصلاحِ نفس کے چار ستون:

پیری مریدی دراصل شریعت وسنت کے نورانی دائرے میں رہتے ہوئے، قربِ الٰہی کے حصول اور ''دوامِ ذکر'' (ہمیشہ اللہ پاک کو یاد رکھنے) کی ایک مبارک جدوجہد ہے۔ یہ اپنے وجود کو شیخِ طریقت کی فراہم کردہ رہنمائی کے سانچے میں ڈھالنے کا نام ہے۔ ایک سچا مرید اپنے مرشد کی نگرانی میں اللہ پاک تک پہنچنے کے ان راستوں کو اختیار کرتا ہے جو کتاب وسنت کے احکام سے ہم آہنگ ہوں، اور وہ اپنی زندگی کو انہی پاکیزہ ہدایات کے مطابق بسر کرنے کا پختہ عزم کرتا ہے۔

راہِ سلوک میں طالبِ حق کو جو مقامات طے کرنے ہوتے ہیں، انہیں چار جامع الفاظ میں سمیٹا جاسکتا ہے:

(۱) اطلاع (احوالِ دل کا اظہار): شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے جب سالک مرشد کی ہدایات پر عمل کرتا ہے، تو اس دوران نفس اور شیطان کی طرف سے آنے والی رکاوٹوں، باطنی امراض اور تکالیف کو بلا جھجک اپنے شیخ کے سامنے پیش کرنا۔ اسی کے لیے رابطہ کا پابند بنایا جاتا ہے۔

(۲) اتباع (علاج پر عمل): شیخ ان باطنی الجھنوں اور امراض کا جو علاج تجویز فرمائے، اس پر پوری دلجمعی اور اہتمام کے ساتھ کاربند ہونا۔

(۳) اعتقاد (مکمل بھروسہ): دل میں یہ پختہ یقین اور اعتقاد رکھنا کہ میرے مرشد نے جو علاج بتایا ہے، وہی میرے لیے سراسر حق، صائب اور نفع بخش ہے، اور اسی راہ پر چل کر مجھے باطنی شفا نصیب ہوگی۔ (جیسے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے بارے میں پختہ اعتقاد تھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو شیخ کامل کی شکل میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملے تھے، ان کے بعد اگر کسی کو ویسا شیخِ کامل ملا ہے تو مجھے حضرت خواجہ باقی باللہؒ ملے ہیں۔)

(۴) انقیاد (سرِ تسلیم خم کرنا): شیخ کی تشخیص اور تجویز کردہ نسخۂ اصلاح کے سامنے اپنی خواہشات کو مٹا کر سرِ تسلیم خم کردینا۔

اصلاح وتربیت کے لیے مناسبت ضروری ہے:

راہِ طریقت میں منزلِ مقصود تک رسائی اور کامیابی کے حصول کے لیے شیخ اور مرید کے درمیان ''مناسبت'' سب سے اولین شرط ہے۔ ارواح کا بھی اپنا ایک بلڈ گروپ ہوتا ہے، جس کا فیصلہ عالمِ ارواح میں ہو چکا ہے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ "مناسبت یہ ہے کہ پیر کی عادات مرید کو اچھی لگیں اور مرید کا انداز پیر کو بھائے۔ اسے جانچنے کے لیے کم از کم چھ ماہ شیخ کی صحبت یا خط و کتابت کا تعلق ضروری ہے۔"

ہمارے حضرت جی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ "سالک کی طرف سے کامل طلب اور شیخ کی طرف سے کامل توجہ (جب یہ دونوں چیزیں) مل جائیں تو کام بنتا ہے"

اگر مرید مخلص ہو اور وہ دور بیٹھا بھی اپنے معمولات پر قائم ہو، تو اللہ تعالیٰ خود اپنے فضل سے شیخ کے دل میں یہ بات ڈال دیتے ہیں کہ "فلاں جگہ میرا ایک بندہ تڑپ رہا ہے، اس کی طرف توجہ کرو"۔ یہی اللہ پاک کا وعدہ ہے کہ "اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ" (سورۃ الاعراف، آیت: ۵۶)

ترجمہ: "اللہ پاک کی رحمت محسنین کے بہت قریب ہے"۔

خلاصۂ کلام:

بیعت دراصل پیر کی طرف سے شریعت پر "چلانے" اور مرید کی طرف سے "چلنے" کے ایک پاکیزہ عہد کا نام ہے۔ اس خوبصورت سفر کو حضرت مولانا شاہ احمد پرتاپ گڑھیؒ نے اس خوبصورت شعر میں سمو دیا ہے:

تنہا نہ چل سکیں گے محبت کی راہ میں
میں چل رہا ہوں، آپ میرے ساتھ آیئے

باقی ہاتھ میں ہاتھ لینا یا کپڑا پکڑنا، یہ تو بزرگوں کی ایک پسندیدہ رسم ہے، اصل چیز دلوں کا سودا اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فدا ہو جانا ہے۔

اللہ پاک سالکین و مریدین کو صحیح مقصد اور نیک نیتی کے ساتھ یہ پاکیزہ سفر طے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یارب العالمین

☆☆☆

سُلُوک کی ڈاک

سلسلہ نمبر (۴)

ہدایۃ السالکین

ضبط وترتیب: مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی

سوال نمبر (۱):

دورانِ مراقبہ ذہن بہت بھٹکتا ہے، بلکہ اللہ پاک کی ذات کا دھیان کم رہتا ہے اور حضرت شیخ صاحب کا زیادہ۔ براہِ کرم رہنمائی فرمائیں؟

جواب: جو شخص اول اول مراقبے میں بیٹھتا ہے تو عموماً اس کو اِدھر اُدھر کے خیالات زیادہ آتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ اب تک جو اس نے غفلت والی زندگی گزاری ہے، وہ سب کچھ اب مراقبے کے ذریعہ باہر آنے لگتا ہے۔

اب ظاہر سی بات ہے کہ جب دنیا کے خیالات، شیطانی، نفسانی، شہوانی اور حیوانی ذہن میں آئیں گے تو اللہ پاک کا دھیان کیسے آئے گا؟

پھر اللہ پاک کے دھیان کے مقابلے میں شیخ کا دھیان آنے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے کمزور ایمان کی وجہ سے اللہ پاک کا وہ استحضار اپنے دلوں میں محسوس نہیں کر پاتے جو کرنا چاہیے جب کہ شیخ کی صحبت میں مستقل رہنا آنا جانا ملنا جلنا ہوتا رہتا ہے اس کی بنا شیخ سے تعلق وقرب محسوس ہوتا ہے اس لیے شیخ کا خیال آجاتا ہے۔

لیکن یہ خیال آنا بے اختیار ہو تو ٹھیک ہے، کوئی گناہ نہیں منع نہیں لیکن اس خیال کو جمانا اور اسی میں مشغول رہنا درست نہیں ہے۔ اس طرف متوجہ ہی نہ ہوں دل اللہ اللہ کہہ رہا ہے میں سن رہا ہوں بس اسی دھن میں رہے۔

سوال نمبر (۲):

مراقبہ الحمد للہ بیس پچیس منٹ ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود کچھ دنوں سے غصہ بہت آرہا ہے۔ براہِ کرم رہنمائی فرمائیں؟

جواب: اس کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کا پہلا سبق چل رہا ہو۔ ہمارے سلسلہ عالیہ میں جو دوسرا سبق ہے اس سے غصہ کا علاج ہوتا ہے۔

لیکن اگر دوسرے سبق پر مراقبہ کے باوجود بھی اس کا علاج نہ ہوا اور غصے میں کمی محسوس نہ ہو رہی ہو تو شیخ کے سامنے اپنے احوال رکھ کر اپنی اصلاح کروانا چاہیے۔

سوال نمبر(۳):

مشائخِ نقشبند ہر روحانی بیماری کا علاج مراقبہ ہی تجویز کرتے ہیں۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

جواب: ہمارے حضرت جی قدس سرہ سے ہم نے یہی سنا ہے کہ مراقبے سے ننانوے فیصد روحانی بیماریوں کا علاج ہوجاتا ہے، مراقبہ کا یہ معمول اتنا طاقتور اور مفید معمول ہے۔

خود حضرت جی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "ہم نے لاکھوں لوگوں کی زندگیوں کو اس مراقبے کی برکت سے بدلتے دیکھا ہے۔"

آج دنیا میں لوگ اُلجھنوں سے نجات پانے کے لیے اور سکون حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کررہے ہیں لیکن اصل اور سنت سے ثابت شکل مراقبہ ہے۔ مراقبہ اور دوسرے طریقوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ان طریقوں سے اللہ پاک تک رسائی نہیں ہوسکتی اور مراقبے کی وجہ سے اُلجھنوں سے بھی نجات ملے گی اور گناہوں سے بھی چھٹکارا نصیب ہوگا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مراقبہ سے اللہ پاک کی معرفت حاصل ہوگی ان شاءاللہ۔

سوال نمبر(۴):

کیا مراقبہ سے گھریلو مسائل، معاشی مسائل اور دنیوی مسائل حل ہوتے ہیں؟

جواب: مراقبہ کرتے ہوئے بنیادی طور پر نیت بس یہ ہو کہ گناہوں بھری زندگی سے جان چھوٹے اللہ پاک راضی ہوں اور ان کا قرب نصیب ہو باقی یہ مسائل خود ہی اللہ پاک اپنی قدرت سے حل فرمائیں گے۔ بہت سے لوگوں نے تجربہ کیا ہے کہ مراقبہ سے ان کی زندگی ہر اعتبار سے پُرسکون ہوئی ہے۔

سوال نمبر(۵):

مراقبہ کے اسباق کیسے بڑھتے ہیں؟

جواب: مراقبہ کے اسباق مراقبہ پر محنت کرنے سے بڑھتے ہیں، جتنا زیادہ مراقبہ کریں گے اور جس قدر مراقبہ کے اثرات آپ کے اندر آئیں گے، اسی اعتبار سے اسباق بڑھیں گے۔

سوال نمبر(۶):

اگر کوئی شخص کسی سے بیعت نہ ہو لیکن پھر بھی مراقبہ کرنا چاہے تو کیا اس کی اجازت ہے؟

جواب: ذکر یعنی اللہ پاک کی یاد کی دو قسمیں ہیں؛ ایک وہ ذکر جو عام ہے یعنی سبحان اللہ کی تسبیح، الحمد للہ کی تسبیح، اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کی تسبیح وغیرہ۔ یعنی وہ اذکار جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں اور صحابہ کرامؓ سے منقول ہیں۔ ان اذکار کی سب کو اجازت ہے، وہ صبح اور شام کے مختلف اوقات میں کیے جاتے ہیں، باقی مراقبہ یا کسی شیخ کا دیا ہوا مخصوص ذکر ان کی نگرانی میں ہی کیا جانا چاہیے۔

سوال نمبر(۷):

بیعت ہو کر تقریباً سال بھر کا عرصہ ہو گیا۔ لیکن کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہو رہی ہے؟

جواب: پہلے یہ بتائیں کہ تبدیلی کی تشریح کیا ہے؟ اگر آپ تبدیلی سے اچھل کود مراد لے رہے ہیں یا کسی کیفیت کے طلب گار ہیں تو اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ ایک لایعنی اور غیر مطلوب ومحمود چیز ہے ایسی تبدیلی کی نیت ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بتائیں کہ معمولات پابندی سے ہو رہے ہیں یا نہیں؟ روزآنہ آدھا گھنٹہ پابندی سے مراقبہ کر رہے ہیں یا نہیں؟

اگر معمولات اور مراقبہ ہی پابندی سے نہیں کر رہے ہیں تو زندگی میں تبدیلی کیسے آئے گی؟ پھر اس صورت میں یہ سوال ہی درست نہیں۔

ہاں اگر معمولات ومراقبہ کی پابندی کے باوجود تبدیلی نہیں آ رہی ہے تو پھر شیخ سے مل کر اپنے تفصیلی احوال رکھیں شیخ آپ کی رہنمائی کریں گے۔

سوال نمبر(۸):

کیا ظہر کے بعد تسبیحات پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: تسبیحات کسی بھی نماز کے بعد پڑھ سکتے ہیں۔ چاہے ظہر بعد پڑھیں، عصر بعد پڑھیں، یا رات کے وقت پڑھیں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆☆☆

اصلاحی و تربیتی منظوم کلام

سلسلہ نمبر (۴)

چھوڑ دے چون و چرا تجویز سے کیا کام ہے

غیر سے مطلب ہی کیا، مقصود سے بس کام ہے
جو ہے عاشق، اس کو کیا پروائے ننگ و نام ہے

مست ہے ہر حال میں جو عاشقِ بدنام ہے
اس کو کلفت میں بھی حاصل راحت و آرام ہے

چھوڑ دے چون و چرا تجویز سے کیا کام ہے
ہے وہی فائز، جو ان کا بندۂ بے دام ہے

مرحبا صلِّ علیٰ، کیا ہی مبارک کام ہے
ہاتھ میں جامِ محبت، لب پہ ان کا نام ہے

وہ ہے محرومِ ازل، جو اب بھی تشنہ کام ہے
جس کا جی چاہے پیے، ساقی کا اذنِ عام ہے

اس کو دنیا اور مافیہا سے کچھ مطلب نہیں
کوچۂ محبوب میں مدت سے جو گمنام ہے

حق کی مرضی میں کرے جو اپنی مرضی کو فنا
دونوں عالم میں اسے آرام ہی آرام ہے

جور میں بھی لطف کی لذت جسے ملتی نہ ہو
عشق میں پختہ نہیں، ہرگز ابھی وہ خام ہے

سر جھکا دیں شوق سے حق کی اطاعت کے لیے
اور کیا شئ ہے، اسی کا نام تو اسلام ہے

ان پہ قرباں، فضل سے اپنے عطا فرمادیا
نعمتِ ایمان تو اللہ کا انعام ہے

کام لے ہمت سے، چل اب کوئے جاناں کی طرف
تو نہ گھبرا، فاصلہ کچھ بھی نہیں، دو گام ہے

کٹ کے غیروں سے فقط اللہ کے ہوجایئے
دوستو! بس احمدِ عاصی کا یہ پیغام ہے

(عارف باللہ حضرت مولانا شاہ احمد صاحب پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ علیہ)

سامنے جلوے ہیں اُن کے کو بہ کو

دردِ دل کے واسطے کر جستجو
زخمِ حسرت اور خونِ آرزو
غم سے ٹکڑے ہو گئے دل کے مگر
دل کے ہر ذرہ میں ہیں انوارِ ھُو
ان کی جانب سے محبت کا مرے
امتحاں ہے ہر شکستِ آرزو
اے خدا تجھ پر فدا ہو ہر زماں
میری دولت میری جان و آبرو
حسرتوں کے غم اگر ہیں راہ میں
سامنے جلوے ہیں ان کے کو بہ کو
ایسی شکلوں کو نہ دیکھوں میں کبھی
آپ سے جو دور کر دے خو برو
تجھ کو کیوں مشکل ہے یہ صرفِ نظر
دیکھ اے ظالم شہیدوں کا لہو
شکر کرتے ہیں غم حسرت پہ ہم
دیکھ کر یارب ترے جام و سبو
دیدۂ اختر ہے گو حسرت زدہ
دیدۂ دل دیکھتی ہے نورِ ھُو

(حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ)